یکم اگست ۲۰۱۹ء | جلد نمبر: ۱۲ ۔ شمارہ نمبر: ۱۵

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیر: غیاث الدین

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱_۳۶۳۴۹۸۴۰(۲۱_۹۲)، فیکس: ۳۶۳۶۱۰۴۰

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلاتبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

٤ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

مشرقِ وسطیٰ کے دو مخالف اتحاد

دلیپ ہیرو

آج کا مشرقِ وسطیٰ اِخوان المسلمون کے حوالے سے منقسم ہے۔ دو مخالف اتحاد ابھر رہے ہیں۔ ایک ترکی، ایران اور قطر پر مشتمل ہے اور دوسرا سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور مصر پر مشتمل ہے۔ دو سال قبل سعودی عرب، مصر اور متحدہ عرب امارات پر مشتمل اتحاد کے مقابل ترکی اور قطر نمودار ہوئے تو ایران نے اُن کی بھرپور حمایت کی۔ یہ سب کچھ سعودی ولی عہد محمد بن سلمان کی مہربانی سے ہوا، جنہوں نے دو سال قبل جولائی میں قطر کی اقتصادی ناکہ بندی کی اور ایران و ترکی سے اُس کے تعلقات کو شدید نقصان پہنچانے والی ۱۳ شرائط پیش کیں۔ سعودی عرب نے قطر پر دباؤ ڈالا کہ وہ ۲۰۱۵ء میں قائم کیے جانے والے ترک فوجی اڈے کو بھی بند کر دے۔ قطر مخالف اتحاد نے یہ بنیادی الزام عائد کیا کہ وہ اخوان المسلمون اور دیگر شدت پسند اسلامی گروہوں کی مدد کر کے دہشت گردی کو ہوا دے رہا ہے۔

محمد بن سلمان نے قطر کے خلاف جا کر اپنی ریاست کی بنیادی پالیسی سے انحراف کیا۔ اُن سے پہلے تک سعودی عرب خطے کے سُنّی اکثریت والے ممالک کو ایران کے خلاف متحد رکھنے کے لیے کوشاں رہا ہے۔ محمد بن سلمان نے پالیسی سے جو انحراف کیا اُس نے قطر کو ایران اور ترکی کی طرف جانے پر مجبور کر دیا۔ محمد بن سلمان نے جو کچھ کیا وہ اس لیے بہت عجیب تھا کہ قطر اور ترکی بھی سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور مصر کی طرح واضح سُنّی اکثریت والے ممالک ہیں۔

اب معاملہ یہ ہے کہ سعودی عرب، مصر اور متحدہ عرب امارات اخوان المسلمون کے خلاف ایک پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں۔ ۱۹۲۸ء میں اخوان المسلمون کے قیام کے وقت اِس کے بانی حسن البناء نے کہا تھا کہ یہ تحریک زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط اصلاحی عمل کے لیے ہے۔ تب سے اب تک اس تنظیم کے نظریات سے متاثر ہو کر درجنوں تنظیمیں بنائی جا چکی ہیں۔ دنیا بھر میں اخوان سمیت تمام ہم خیال تنظیموں کو بڑے پیمانے پر فنڈ دیے جاتے ہیں۔ آج متعدد ممالک میں اخوان اور اس کی ہم خیال تنظیموں کے تحت اسپتال، اسکول اور دیگر فلاحی ادارے چلائے جا رہے ہیں۔

اخوان نے مصر میں سیاسی بنیاد پر کیے جانے والے تشدد کو باضابطہ طور پر ترک کر کے سیاسی عمل میں حصہ لینے کی ابتدا کی۔ یہ ۱۹۹۰ء کے عشرے کی بات ہے۔ سیکولر جماعتوں سے اتحاد بھی کیا گیا۔ ۲۰۰۵ء میں قانون ساز ادارے کی ۴۴۴ نشستوں کے لیے انتخابی عمل میں حصہ لینے کی اجازت ملی تو اخوان نے ۲۰ فیصد نشستوں پر کامیابی حاصل کی، مگر اس وقت کے ڈکٹیٹر حسنی مبارک نے اخوان کی کامیابی کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اُسے سختی سے کچلنے کی بھرپور کوشش کی۔ عرب دنیا میں جب بیداری کی لہر اٹھی تب اخوان نے خود کو الگ تھلگ رکھا تاکہ انتھارٹیز کو نئی تحریک کے خلاف طاقت کے بے محابا استعمال کا کوئی جواز نہ ملے۔ فروری ۲۰۱۱ء میں حسنی مبارک کے اقتدار کے خاتمے کے بعد اخوان نے کھل کر کام کیا۔ جون ۲۰۱۲ء میں مصر کے پہلے آزادانہ اور شفاف صدارتی انتخابات ہوئے تو اخوان المسلمون کے لیڈر محمد مرسی صدر منتخب ہوئے۔ صرف ایک سال کے اندر جرنیل متحد ہوئے اور جنرل عبدالفتاح السیسی کی قیادت میں محمد مرسی کی صدارت کا تختہ الٹ دیا۔ اخوان پر پابندی عائد کر دی گئی اور اس کے اثاثے ضبط کر لیے گئے۔ سیکورٹی فورسز نے کسی جواز کے بغیر اخوان المسلمون کے پُرامن مظاہرین پر پانچ مرتبہ فائر کھولا۔ ۱۱۵۰ افراد شہید ہوئے اور ۶۰ ہزار سے زائد افراد کو جیل بھیج دیا گیا۔

یہ سب کچھ کرنے پر جنرل عبدالفتاح السیسی کی قیادت میں قائم حکومت کو سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کی طرف سے بھرپور مدد ملی۔ دونوں ممالک کے مطلق العنان آمر اسلامی شریعت کے اصولوں کی بنیاد پر حکومت کرنے کو ترجیح دیتے ہیں مگر وہ اِس بات سے خوفزدہ رہتے ہیں کہ اخوان المسلمون کے لیڈر بیلٹ بکس کے ذریعے بھی شرعی حکومت قائم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور وہ یہ بات ثابت بھی کر چکے ہیں۔ سعودی عرب کے لیے دوسری پریشان کن بات یہ ہے کہ رجب طیب ایردوان کی قیادت میں ترکی کی حکمراں جماعت جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی (اے کے

اندرونی صفحات پر:۔

- لیبیا شورش کی زد میں
- امریکا ایران کشیدگی: تیل کی قیمتوں پر اثرات
- وزیراعظم عمران خان کے دورۂ امریکا کا حاصل؟
- عاجزی: تم دنیا کی نگاہوں کا مرکز نہیں ہو!
- شام کی خانہ جنگی۔۔ حتمی مرحلہ یا ایک نیا آغاز۔۔
- آسام: غیر قانونی شہریوں کی تلاش
- آسام میں بھارتی حکومت کا پاگل پن!
- پاکستان کا قیام اور دہلی میں پہلا سفارتی تقرر
- بیچارے، اسلام سے خوفزدہ کیوں؟

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi. REG No. SC-1303

پی) بھی اخوان سے نظریاتی ہم آہنگی رکھتی ہے۔اس جماعت نے بھی اسلامی شریعت کو بنیاد بنا کر انتخابی کامیابی حاصل کی اور ترکی میں طویل المیعاد اقتدار بھی قائم کیا۔سیکولر آئین کے ہوتے ہوئے ۲۰۰۲ء میں اے کے پی نے غیر معمولی انتخابی کامیابی حاصل کر کے دنیا کو حیران کر دیا اور یوں ترکی میں مطلق العنان حکومتوں کی راہ مسدود ہوئی۔

ایران سے بھی اخوان المسلمون کے تعلقات بہت اچھے رہے ہیں۔ایران میں انتخابات باقاعدگی سے ہوتے رہے ہیں اور ان میں اسلامی نظریات کی طرف واضح جھکاؤ رکھنے والے کامیاب ہوتے آئے ہیں۔ اخوان المسلمون کے کارکنوں اور قائدین کی واضح اکثریت سُنّی ہے تاہم وہ شیعوں کو بھی مساوی سمجھتے ہیں۔

۲۰۱۱ء میں جب عرب دنیا میں بیداری کی لہر اٹھی تو قطر کے حکمران حماد بن خلیفہ الثانی نے محسوس کیا کہ ہیلٹ باکس کے ذریعے اخوان المسلمون اقتدار کے ایوانوں تک آ کر سیاسی نظریات کے حوالے سے انقلاب برپا کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست کی نگرانی میں کام کرنے والے چینل الجزیرہ نے اخوان کا ساتھ دیا۔ انقلاب کے رونما ہونے کے بعد جب جوابی کارروائیاں شروع ہوئیں تو اخوان کے متعدد رہنماؤں نے قطر اور ترکی میں پناہ لی۔

جون ۲۰۱۳ء میں قطری حکمران نے اپنے بیٹے تمیم کے حق میں اقتدار سے دست بردار ہونا گوارا کیا۔اس کے بعد ۴۵ نشستوں والی مجلس شوریٰ کی دو تہائی نشستوں کے لیے انتخابات کے انعقاد کا منصوبہ ترک کر دیا گیا۔۲۰۰۴ء میں منظور اور نافذ کیے جانے والے قانون کے تحت حکومت نئے قوانین اسمبلی میں بحث کے بعد ہی نافذ کر سکتی ہے۔ نئے حکمران نے موعودہ انتخابات کو کئی بار ملتوی کیا ہے۔اب نئی تاریخ جون ۲۰۲۲ء کی دی گئی ہے۔اس کے صرف پانچ ماہ بعد قطر میں فٹبال کا ورلڈ کپ منعقد کیا جانا ہے۔ یہ ایوان ترکی کے لیے بھی غیر معمولی دلچسپی کا ہے۔

سعودی عرب کی قیادت میں قطر کے خلاف سفارتی اور اقتصادی حملے سے صرف چار ماہ قبل ترکی کی تیکفن کنسٹرکشن کمپنی نے قطر کے دارالحکومت دوحہ میں ۴۰ ہزار نشستوں والا فٹبال اسٹیڈیم تعمیر کرنے کے لیے قطر کی الجابر انجینئرنگ کمپنی سے معاہدہ کیا تھا۔ یہ اسٹیڈیم ۲۰۲۲ء کے فیفا فٹبال ورلڈ کپ کے حوالے سے تعمیر کیا جانا ہے۔ یہ اسٹیڈیم تیزی سے تعمیر کیا جانا تھا۔ اس کے لیے خام مال کی فراہمی بھی تیزی سے کی گئی۔ جب سعودی عرب نے قطر کی اقتصادی ناکہ بندی کی کوشش کی تو ترکی نے خوراک اور دیگر ضروری اشیا سے بھرے ہوئے جہاز تیزی سے قطر بھیجے۔ایران نے بھی ایسا ہی کیا اور یوں متعلقہ تجارت کا حجم تیزی سے بڑھ گیا۔ایران کی فضائی حدود ہر روز قطر سے ۲۰۰ سے زائد اضافی پروازوں کی میزبانی کرنے لگیں۔نومبر ۲۰۱۷ء میں ترکی، ایران اور قطر نے ایک سمجھوتے پر دستخط کیے، جس کے تحت ایران کو ترکی اور قطر کے درمیان تجارت کے لیے ٹرانزٹ کنٹری کا کردار ادا کرنا تھا۔ اگلے ہی مہینے انقرہ نے جنوبی دوحہ میں اپنے فوجی اڈے کے لیے مزید تین ہزار فوجی بھیجے اور اُس کے ٹینکوں نے قطری دارالحکومت کی سڑکوں پر گشت بھی کیا۔ اگست ۲۰۱۸ء میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے ترکی سے اسٹیل اور المونیم کی برآمدات پر ٹیکس بڑھا کر ترکی میں کرنسی کا بحران پیدا کرنے کی کوشش کی۔اس کا بنیادی مقصد عیسائی پاسٹر اینڈریو برنسن کو رہا کرانا تھا، جو دو سال قبل دہشت گردی میں ملوث ہونے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔قطر کے امیر فوری طور پر انقرہ پہنچے اور ترک مالیاتی مارکیٹ کو مضبوط کرنے کے لیے فوری طور پر ۱۵ ارب ڈالر دینے کا اعلان کیا۔اس کے نتیجے میں ترک لیرا مضبوط ہوا۔قطری حکمران تمیم الثانی نے اعلان کیا کہ ہر مشکل گھڑی میں قطر اور ترکی ساتھ ساتھ ہیں۔

دسمبر ۲۰۱۷ء میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی طرف سے اسرائیلی دارالحکومت تل ابیب سے مقبوضہ بیت المقدس منتقل کرنے کے اعلان پر ترکی کے صدر رجب طیب ایردوان نے ۵۷ ارکان والی اسلامی کانفرنس کی تنظیم (او آئی سی) کا ہنگامی سربراہ اجلاس بلانے پر زور دیا تھا۔ اسرائیلی دارالحکومت کی منتقلی اقوام متحدہ کی ۱۰ قراردادوں کی صریح خلاف ورزی تھی۔او آئی سی کی سربراہ کانفرنس نے مشرقی بیت المقدس کو فلسطین کا دارالحکومت قرار دیا۔اس کانفرنس میں ۵۰ سربراہانِ ریاست نے شرکت کی اور امیر تمیم بھی ان میں شامل تھے۔ خادم حرمین شریفین شاہ سلمان بن عبدالعزیز نے اس کانفرنس میں شرکت نہیں کی۔

اکتوبر ۲۰۱۸ء میں استنبول کے سعودی قونصلیٹ میں منحرف سعودی صحافی جمال خاشقجی کے قتل کے بعد انقرہ اور ریاض کے تعلقات مزید کشیدہ ہو گئے۔اس قتل کی منصوبہ بندی کا الزام سعودی ولی عہد محمد بن سلمان کے دفتر پر عائد کیا جاتا ہے۔اس کے بعد مئی میں جب او آئی سی کی چیئرمین شپ سعودی عرب کو دینے کا موقع آیا تو کسی کو یہ دیکھ کر حیرت نہ ہوئی کہ ترک صدر رجب طیب ایردوان متعلقہ تقریب میں شریک نہ ہوئے۔ وزیر خارجہ میولوت کاوُتو غلو نے وزرائے خارجہ کے نچلے درجے کے اجلاس میں شریک ہو کر رسمی کارروائی کی۔اس کے بعد علاقائی سطح پر کشیدگی بڑھی ہے۔۱۲ مئی کو امریکی پابندیوں کے نئے دور کی ابتدا کے بعد متحدہ عرب امارات کی بندرگاہ فجیرہ کے نزدیک ایران کے چار آئل ٹینکروں کو نقصان پہنچایا گیا۔خلیج مجلس تعاون (جی سی سی) کے چیئرمین کی حیثیت سے شاہ سلمان بن عبدالعزیز نے ہنگامی سربراہ اجلاس طلب کیا جس میں اپنے قطری ہم منصب کو بھی بلایا۔ امیر تمیم نے وزیر خارجہ محمد بن عبدالرحمٰن الثانی کو بھیجا۔ دوحہ سے واپسی پر انہوں نے سربراہ اجلاس کے مشترکہ اعلامیے سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''انہوں نے ایران کے معاملے میں واشنگٹن کی پالیسی اپنائی ہے۔ ایران ایک پڑوسی ہے اور اس حوالے سے جو کچھ بھی سوچا جانا چاہیے وہ نہیں سوچا گیا''۔

سعودی ولی عہد کے لیے مزید پریشانی کی بات یہ ہے کہ قطر نے امریکا سے تعلقات مزید بہتر بنا لیے ہیں۔جنوری ۲۰۱۹ء کے وسط میں قطری حکومت نے العدید کے فوجی اڈے کی توسیع کے لیے وزیر خارجہ مائک پومپیو کے دورے کے لیے گرین سگنل دے دیا۔اس فوجی اڈے پر گیارہ ہزار امریکی فوجی تعینات ہیں اور یہ پینٹاگون کی سینٹرل کمانڈ کے فارورڈ ہیڈ کوارٹرز کے طور پر کام کرتا ہے۔ ایک ماہ بعد امیر تمیم نے ایرانی انقلاب کے چالیس سال مکمل ہونے پر ایرانی صدر حسن روحانی کو مبارک باد کا پیغام بھیجا، جو ٹرمپ انتظامیہ کے لیے چھوٹا سا تازیانہ ہی تھا۔

ٹرمپ انتظامیہ اب تک ریاض، قاہرہ، ابوظہبی محور کے ساتھ ہے مگر وہ قطر اور ترکی کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔ ترکی معاہدہ شمالی بحر اوقیانوس کی تنظیم (نیٹو) کا واحد اسلامی رکن ہے اور اس اتحاد میں امریکا کے بعد سب سے بڑی فوج اُسی کی ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قطر اور ترکی، امریکا کی ناراضی کی پروا کیے بغیر، ایران سے بہتر تعلقات کے حامل ہیں۔

(دلیپ ہیرو کی تازہ ترین، سینتیسویں کتاب ''کولڈ وار اِن دی اسلامک ورلڈ: سعودی عربیہ، ایران اینڈ سی اسٹرگل فار سپریمیسی'' ہے جو آکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کی ہے۔)

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Two opposing Middle East alliances for the US - ". ("Yale Global Online". July 10, 2019)

لیبیا شورش کی زد میں

Ketan Mehta

اسلامی شدت پسند گروہوں کے حوالے سے پائے جانے والے خطرے نے بظاہر ہنتار کی اُن کوششوں کو توانائی بخشی ہے، جو وہ اقوام متحدہ کے تحت شرفِ قبولیت سے ہم کنار قومی اتفاق رائے کی حکومت کے قیام کے حوالے سے کر رہے ہیں۔ ۲۰۱۱ء میں ملک بھر میں برپا ہونے والی شورش کے نتیجے میں لیبیا جن خرابیوں سے دوچار ہے اُنہیں اب سات سال ہونے کو آئے ہیں۔ جب کرنل معمر قذافی کا اقتدار ختم ہوا تب بہت سوں کو امید تھی کہ اب لیبیا ایک ایسی ریاست کی حیثیت سے ابھرے گا، جہاں آزادی بھی ہوگی اور سب کو قبول کرنے کا احساس بھی۔ ٹرپولی میں قائم قومی اتفاق رائے کی حکومت، جس کے قائد فیاض السراج ہیں، لیبیا کی سالمیت برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کر رہی ہے۔ کئی ایسے سنگین مسائل اور ایشوز ہیں جو لیبیا کو جمہوریت کی طرف جانے سے روک رہے ہیں۔ کئی مسلح انتہا پسند گروپ ملک کے مختلف علاقوں پر قابض ہیں اور کسی بھی طور پسپا یا اپنے زیر تسلط علاقوں سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔ ان گروہوں کے ہاتھوں پیدا ہونے والی صورتِ حال ملک کو حقیقی اور دیرپا سیاسی استحکام کی طرف جانے سے روک رہی ہے۔

اقوام متحدہ کی حمایت یافتہ قومی اتفاق رائے کی حکومت اور اس کی اتحادی ملیشیاؤں نے ملک کے مغربی علاقوں پر اپنا تصرف قائم کر رکھا ہے، جبکہ قذافی دور کے کمانڈر خلیفہ ہفتار نے ملک کے بہت سے مشرقی علاقوں کو کنٹرول کر رکھا ہے۔ ان کے علاوہ بھی چند اسلامی گروہوں سمیت متعدد گروہ ہیں جو بڑے شہروں اور ملک کے جنوبی علاقوں میں غیر معمولی اثر رکھتے ہیں۔

اس وقت لیبیا کے لیے سب سے بڑا مسئلہ وہ اسلامی گروہ ہیں، جو ایک مضبوط اور باقاعدہ مرکزی حکومت کے نہ ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی پوزیشن تیزی سے مستحکم کر رہے ہیں۔ کرنل معمر قذافی کے دور میں اسلامی گروہوں کو زیادہ ابھرنے کا موقع نہیں ملتا تھا کیونکہ اُنہیں کنٹرول کرنے کے لیے طاقت کا بے محابا استعمال کیا جاتا تھا۔ قومی اتفاق رائے کی حکومت کی کمزوری اور اسلامی گروہوں کے خلاف متحرک ہونے کے حوالے سے بین الاقوامی دباؤ نے خلیفہ ہفتار کو وہ ملیشیا متحرک کرنے کی تحریک دی ہے، جو قومی اتفاق رائے کی حکومت کے لیے بھی ایک چیلنج کا درجہ رکھتی ہے۔ لیبیا کو کئی مسائل کا سامنا ہے، جن میں سلامتی یقینی بنانا اور ملک کو واضح سیاسی سمت فراہم کرنا نمایاں ہیں مگر اب اِن سمیت تمام مسائل کو ثانوی نوعیت کا درجہ حاصل ہوگیا ہے۔ اس وقت ساری توجہ اسلامی شدت پسند گروہوں کو کنٹرول کرنے پر مرکوز رکھی جارہی ہے۔ اسلامی گروہوں کا بڑھتا ہوا اثر و رسوخ لیبیا ہی کے نہیں بلکہ مصر سمیت پورے خطے، بلکہ یورپ کے لیے بھی خطرے کی گھنٹی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خلیفہ ہفتار کو تیل کی دولت سے مالا مال علاقوں میں اپنی پوزیشن بہتر بنانے کا موقع ملا ہے۔ مصر کو یہ خوف لاحق ہے کہ لیبیا میں پائی جانے والی غیر یقینی صورتِ حال اور نراجیت اُس کے سینائی کے علاقے میں خرابیوں کو جنم دے سکتی ہے۔ دوسری طرف صحرائے صحارا کے زیریں خطے میں واقع ممالک میں بھی اسلامی شدت پسندوں کے ابھرنے کا خطرہ برقرار ہے۔ یہ فرانس کی افریقا پالیسی کے لیے انتہائی خطرناک سمجھا جارہا ہے۔ بڑے پیمانے پر نقل مکانی اور توانائی کے شعبے میں سرمایہ کاری یورپی طاقتوں کے لیے خارجہ پالیسی کے حوالے سے اہم ایشوز ہیں۔ لیبیا میں غیر معمولی دلچسپی لینے والی یورپی طاقتوں میں فرانس اور اٹلی نمایاں ہیں۔

لیبیا میں قومی اتفاق رائے کی حکومت اور خلیفہ ہفتار کی قیادت میں قائم سیاسی سیٹ اپ کے درمیان کشمکش جاری ہے اور بہت سی بیرونی قوتیں اسلامی گروہوں سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت اور دیگر معاملات میں خلیفہ ہفتار کی ملیشیا پر زیادہ انحصار پذیر دکھائی دے رہی ہیں۔ خلیفہ ہفتار کو قومی اتفاق رائے کی حکومت سے لڑنے کے حوالے سے مصر، متحدہ عرب امارات اور فرانس سے اسلحہ، عسکری تربیت اور انٹیلی جنس سے متعلق معاملات میں غیر معمولی مدد ملی ہے۔ مصر، متحدہ عرب امارات اور فرانس کی طرف سے غیر معمولی معاونت ملنے کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ لیبیا میں بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ قومی اتفاق رائے کی حکومت کے مقابل اُس کی بہت سی قابلِ اعتراض سرگرمیوں پر کوئی قدغن نہیں لگائی جاسکی ہے اور اس کے برعکس حقیقت تو یہ ہے کہ قومی اتفاق رائے کی حکومت نے جب بھی خلیفہ ہفتار کی قیادت میں کام کرنے والی ملیشیا کے خلاف کچھ کرنا چاہا ہے تو اُس پر بیرونی طاقتوں نے تنقید کی ہے۔ خلیفہ ہفتار کی ملیشیا کے ہاتھوں انسانی حقوق کی صریح خلاف ورزیوں سے بھی صرفِ نظر کیا جانا عام ہے۔ یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ خلیفہ ہفتار کی ملیشیا کو سلافیوں کی بھی حمایت حاصل ہے جبکہ بیشتر بیرونی قوتیں لیبیا کے معاملات میں ایسے گروہوں کی مداخلت پسند نہیں کرتیں۔

لیبیا کے سیاسی مستقبل کے حوالے سے کوئی راستہ متعین کرنے میں بیرونی قوتیں بھی کلیدی کردار ادا کرنے کی کوشش کرتی رہی ہیں، مگر اس کردار کو زیادہ تسلیم کیا گیا ہے نہ سراہا گیا ہے۔ بیرونی قوتوں نے کرنل معمر قذافی کا اقتدار ختم کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا اور اُس کے بعد سیاسی استحکام پیدا کرنے کی کوششیں بھی بہت کی ہیں۔ خلیج، عرب اور شمالی افریقا پر مشتمل خطے میں سیاسی محاذ آرائی چند عشروں سے عروج پر ہے۔ خلیجی مجلس تعاون اور سعودی عرب وغیرہ ایک طرف ہیں جبکہ دوسری طرف ایران ہے جبکہ اِن دونوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ترکی بھی خلیج اور شمالی افریقا کے خطے میں اپنے اثر و رسوخ کا دائرہ مزید وسیع کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ لیبیا جیسے عرب اسلامی نیچر کے حامل افریقی ممالک میں خطے کے بڑے اور طاقتور ممالک اپنا کھیل جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اُن کے حمایت یافتہ گروہوں کے درمیان لڑائی نے اِن ممالک کو تباہی سے دوچار کر رکھا ہے اور یہ سلسلہ مستقبل قریب میں ختم ہوتا یا رکتا دکھائی نہیں دیتا۔

لیبیا میں بھی بیرونی قوتیں اپنا کھیل جاری رکھے ہوئے ہیں اور ان میں ترکی اور قطر نمایاں ہیں، جو قومی اتفاق رائے کی حکومت کی بھرپور حمایت و مدد کر رہی ہیں۔ سعودی عرب نے خلیفہ ہفتار کی مدد کرنے کو ترجیح دی ہے۔ امریکا، فرانس اور دیگر طاقتیں غیر معمولی طور پر محتاط ہیں اور قومی اتفاق رائے کی حکومت یا خلیفہ ہفتار کی ملیشیا میں سے کسی کی کھل کر حمایت اور مدد نہیں کر رہیں۔ روس نے بھی اب تک واضح نہیں کیا کہ لیبیا میں وہ کس کے ساتھ ہے۔ خلیفہ ہفتار نے لیبیا کے معاملات میں ترکی کی مداخلت پر شدید برہمی کا اظہار کرتے ہوئے ''جوابی کارروائی'' تک کی دھمکی دینے سے گریز نہیں کیا ہے۔

بیرونی قوتیں لیبیا میں اپنے مفادات کے تحت کسی بھی گروہ کی مدد کرتی ہیں مگر سیاسی استحکام کی تلاش کے حوالے سے وہ اپنی ترجیحات کے تعین میں اب تک مجموعی طور پر ناکام

باقی صفحہ نمبر ۱۵

امریکا ایران کشیدگی: تیل کی قیمتوں پر اثرات

Vincent Lauerman

حالیہ دنوں میں ایران کی جانب سے امریکی ڈرون گرائے جانے کے بعد آبنائے ہرمز کو تیل بردار بحری جہازوں کے لیے بند کرنے اور اس کے ساتھ ہی خلیج میں ایک اور جنگ کے امکانات میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ ایران کے اس قدم سے امریکا کے لیے یہ خطرہ پیدا ہوا ہے کہ امریکی حملے کی صورت میں ایران نہ صرف امریکا اور اس کے اتحادیوں کو خاطر خواہ نقصان پہنچا سکتا ہے بلکہ وہ خطے کے دیگر ممالک کی جانب سے تیل کی برآمدات کو بھی روک سکتا ہے۔

ایران ۵۳۔۱۹۵۱ء کی تجارتی پابندیوں کو بھولا نہیں ہے۔ یہ پابندیاں ہی جمہوری طور پر منتخب وزیر اعظم محمد مصدق کی برطرفی کا سبب بنیں۔ جس کے بعد سی آئی اے نے اقتدار دوبارہ محمد رضا پہلوی کے حوالے کر دیا تھا۔

ایران کی جانب سے آبنائے ہرمز کو بند کرنے سے تیل کی منڈیوں پر غیر معمولی اثرات ہوں گے۔

آبنائے ہرمز کی بندش:

ایرانی بحریہ اور پاسدارانِ انقلاب کے بحری بیڑے کی قیادت کو یہ معلوم ہے کہ روایتی بحری جنگ میں وہ امریکا کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس وجہ سے ایران ۸۸۔۱۹۸۰ء کی ایران۔عراق جنگ کے بعد سے ہی آبنائے ہرمز کو بند کرنے کے لیے درکار صلاحیت کے حصول کی کوششوں میں مصروف رہا ہے۔ ان صلاحیتوں میں ہزاروں بارودی سرنگیں، تارپیڈو، جدید کروز میزائل، چھوٹی بڑی آبدوزیں اور تیز رفتار چھوٹی کشتیوں کا بیڑہ شامل ہے۔ ان میں سے اکثر آبنائے ہرمز میں ہی تعینات ہیں۔

امریکا کے نزدیک آبنائے ہرمز میں بحری تجارت کے لیے ایرانی بحریہ ایک خطرہ ہے۔ پینٹاگون کے ماہرین کا خیال ہے کہ ایران اپنی تمام بحری صلاحیتوں کو آبنائے ہرمز میں آمدورفت کو متاثر کرنے اور امریکی فوج کی خطے تک رسائی روکنے لیے استعمال کر سکتا ہے۔

سابق امریکی سیکرٹری دفاع جیمس میٹس نے ۲۰۱۰ء سے ۲۰۱۳ء کے درمیان امریکی سینٹرل کمانڈ کی کمان کرتے ہوئے ایک کثیر القومی منصوبہ بنایا تھا۔ اس منصوبے کا مقصد ایران کو آبنائے ہرمز میں بارودی سرنگیں بچھانے سے روکنا اور پہلے سے موجود بارودی سرنگوں کا صفایا کرنا تھا تاکہ بحری آمدورفت میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ بارودی سرنگوں پر زیادہ توجہ اس لیے دی گئی کیوں کہ جدید تیل بردار بحری جہازوں کو کسی تارپیڈو یا میزائل سے زیادہ بارودی سرنگوں سے خطرہ ہوتا ہے۔

امریکی فوج کے منصوبہ ساز افراد اس بات پر متفق ہیں کہ اگر ایران آبنائے ہرمز کو بند کرنے کی کوشش کرتا ہے تو امریکی افواج ایرانی افواج پر غالب آجائیں گی۔ لیکن اس میں کتنا وقت لگے گا، اس بارے میں ان منصوبہ ساز افراد میں اختلاف ہے۔ کسی کا کہنا ہے کہ اس میں چند دن لگیں گے جبکہ کچھ کا کہنا ہے کہ بحری آمدورفت معمول پر آنے میں تین مہینے لگ سکتے ہیں۔

آبنائے ہرمز میں جاری کشیدگی خطے کے دیگر ممالک تک پھیل سکتی ہے۔ اس کے نتیجے میں خلیج فارس میں کسی جنگ کا آغاز بھی ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو خطے میں تیل اور گیس کی پیداوار اور برآمدات کو خاطر خواہ نقصان پہنچ سکتا ہے۔

اگر امریکی افواج ایران پر حملہ آور ہوتی ہیں یا ایران کو ایسا محسوس ہوا کہ امریکا اس پر حملہ کرنے والا ہے، تو وہ جلد از جلد امریکی افواج اور اس کے اتحادیوں جیسے سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات پر فضائی حملے اور میزائل حملے کرنے کی کوشش کرے گا۔ ایران جوابی حملے میں جلدی اس لیے کرے گا تاکہ امریکی حملے کے نتیجے میں اپنے ہتھیاروں کو تباہ ہونے سے پہلے استعمال کر لے۔

آبنائے ہرمز کی بندش کے ممکنہ اثرات:

آبنائے ہرمز کی بندش کے تیل کی عالمی منڈی پر کیا اثرات ہوں گے اس کا انحصار تیل کی ترسیل میں ہونے والی یومیہ کمی پر ہوگا۔ اوپر کی گئی گفتگو کی بنیاد پر مستقبل کے تین منظر نامے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں سے دو کا تعلق براہ راست آبنائے ہرمز سے اور ایک کا خلیج فارس میں ہونے والی ممکنہ جنگ سے ہے۔

اگر آبنائے ہرمز صرف چند روز کے لیے ہی بند ہوتی ہے تو عالمی منڈی پر اس کے نسبتاً کم اثرات مرتب ہوں گے۔ اس کے باوجود ابتدائی غیر یقینی کی وجہ سے تیل کی فی بیرل قیمت ۱۰۰ ڈالر تک جا سکتی ہے، لیکن یہ جلد ہی اپنی اصل قیمت پر واپس آجائے گی۔

آبنائے ہرمز کی بندش سے یومیہ ۲۰ ملین بیرل تیل کی ترسیل رک جائے گی۔ تاہم اس کے متبادل کے طور پر سعودی عرب اور ابوظہبی کی تیل پائپ لائن کو استعمال کر کے یومیہ چار ملین بیرل تیل کی ترسیل جاری رکھی جا سکتی ہے۔

دوسرا اور قدرے مایوس کن منظر نامہ یہ ہو سکتا ہے کہ آبنائے ہرمز ڈیڑھ سے دو ماہ کے لیے مکمل بند ہو جائے۔ ایسی صورت حال میں تیل کی قیمتوں میں ہوش ربا اضافہ ہو جائے گا، جو ایک مدت تک برقرار بھی رہے گا۔ تیل کے عالمی ذخائر تیل کی ترسیل میں آنے والی کمی کو پورا کر سکتے ہیں لیکن ان ذخائر سے یومیہ ترسیل کو برقرار رکھنا ایک چیلنج ہوگا۔

گزشتہ مطالعات یہ بتاتے ہیں کہ کسی بحران کی صورت میں انٹرنیشنل انرجی ایجنسی کے ممبر ممالک کے ذخائر سے پہلے ماہ میں یومیہ ۱۴٫۴ ملین بیرل اور دوسرے ماہ میں یومیہ ۱۲٫۵ ملین بیرل تیل فراہم کیا جا سکتا ہے۔ بھارت اور چین کے پاس تیل کے عالمی ذخائر کا پانچواں حصہ ہے جو کہ بحران سے نپٹنے کی عالمی کوششوں میں معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

ریاض میں قائم ایک تحقیقی ادارے کے مطابق اگر اضافی تیل موجود نہ ہو تو کسی بحران کی صورت میں تیل کی قیمت ۳۲۵ ڈالر فی بیرل تک پہنچ سکتی ہے، جیسا کہ لیبیا کے بحران کے دوران ہوا تھا۔ اُس پورے عرصے میں عالمی ذخائر سے صرف ۲۰ ملین بیرل تیل فراہم کیا گیا تھا۔

تیسرا اور سب سے خطرناک منظر نامہ خلیج میں ممکنہ جنگ کی صورت میں سامنے آ سکتا ہے، جس میں آبنائے ہرمز تین ماہ کے لیے بند ہو جائے اور خلیج کے تیل پیدا کرنے والے ممالک اور تیل برآمد کرنے کے انفرا اسٹرکچر کو خاطر خواہ نقصان پہنچے۔ سعودی کمپنی آرامکو کے پلانٹ پر ہونے والا کوئی حملہ ایک سال یا اس سے زیادہ عرصے کے لیے تیل کی ترسیل میں یومیہ ۷ ملین بیرل کی کمی کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں تیل کی قیمتوں میں ناقابل یقین حد تک اضافہ ہو جائے گا اور یہ عالمی معیشت کے تباہ ہو جانے تک اسی سطح پر رہیں گی۔

اگر اس صورت حال میں سعودی عرب کے ۲۰۰ ملین بیرل یومیہ کے ذخائر اور دیگر تنصیبات محفوظ رہتی ہیں تو دیگر عالمی ذخائر کی مدد سے اس بحران کے منفی اثرات کو کچھ حد تک کم کیا جا سکے گا۔

(ترجمہ: محمد عمید فاروقی)

"Persian gulf conflict could send oil beyond $325". ("oilprice.com". July 7, 2019)

وزیراعظم عمران خان کے دورۂ امریکا کا حاصل؟

آصف شاہد

وزیراعظم عمران خان کی امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ سے ملاقات پر بھارت کی نظریں ضرور تھیں لیکن جو کچھ صدر ٹرمپ نے کہا بھارتیوں کو اس کی توقع ہرگز نہیں تھی۔

صدر ٹرمپ نے دوٹوک انداز میں کہا کہ بھارتی وزیراعظم نے جاپان میں ۲ ہفتے پہلے ہونے والی ملاقات میں ان سے کشمیر کے تنازع پر ثالثی کی درخواست کی۔ ٹرمپ انتظامیہ کی طرف سے ثالثی کی پیشکش دسمبر ۲۰۱۶ء میں بھی کی گئی تھی لیکن اس وقت یہ نہیں کہا گیا تھا کہ بھارتی حکومت ثالثی کی متمنی ہے۔

امریکی نائب صدر مائیک پینس نے ایک ٹی وی انٹرویو میں کہا تھا کہ صدر ٹرمپ اپنی ڈیل میکنگ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے کشمیر کا مسئلہ حل کروا سکتے ہیں۔ اس بار صدر ٹرمپ کی طرف سے ثالثی کی بات کرنا اور اس کے لیے بھارتی وزیراعظم کی خواہش کا انکشاف بھارتی میڈیا اور پارلیمان میں ایک زبردست دھماکے کا سبب بن گیا۔

یہ ایک بیان وزیراعظم عمران خان کے دورہ کا حاصل اور ایک بڑی کامیابی ہے، کیونکہ بھارت طویل سفارتی کوششوں اور تخریبی کارروائیوں کے ذریعے پاک-بھارت تنازعات کو کسی اور فریم میں فٹ کر چکا تھا۔

بھارت نے مسئلہ کشمیر کو بھی دہشت گردی سے جوڑ کر پاکستان کو تنہا کرنے کے لیے بے انتہا سفارتی اور سیاسی سرمایہ کاری کی تھی، لیکن اب صدر ٹرمپ نے نہ صرف کشمیر کو پاک بھارت تعلقات میں بنیادی مسئلے کے طور پر تسلیم کیا بلکہ بھارتی وزیراعظم کو بھی بیک فٹ پر لے گئے۔

بھارتی پارلیمان کے دونوں ایوان اِن سیشن ہیں اور بھارت کے وزیرخارجہ اپوزیشن جماعتوں کو مطمئن کرنے میں ناکام رہے۔ اپوزیشن جماعتوں کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی نے مطالبہ کیا کہ وزیراعظم نریندر مودی خود ایوان میں آکر وضاحت دیں۔ اب مودی کے لیے امریکی صدر کو سیدھا سیدھا جھوٹا قرار دینا بہت بڑی سفارتی آزمائش ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بھارت اور امریکا کے تعلقات انتہائی گرم جوشی کے بعد تجارتی تنازع کا شکار ہیں اور مودی کو ستمبر میں واشنگٹن بھی جانا ہے۔

قوم پرستی کی لہر کا شکار بھارتی میڈیا تو جیسے یہ تصور بھی نہیں کرسکتا کہ مودی نے صدر ٹرمپ سے ایسی کوئی درخواست کی ہوگی۔ لیکن بھارتی میڈیا یہ بھول رہا ہے کہ اس سال فروری میں بھارت اور پاکستان کے درمیان ہونے والی فضائی جھڑپوں کے بعد انتہائی کشیدہ صورت حال میں بہتری صدر ٹرمپ کے ایک بیان کے بعد ہی آئی تھی، جو انہوں نے کم جونگ ان سے انتہائی اہم ملاقات کی مصروفیت سے وقت نکال کر دیا تھا۔

صدر ٹرمپ نے ویتنام کے دارالحکومت میں کھڑے ہوکر کہا تھا کہ چند گھنٹوں بعد پاک-بھارت تعلقات کے حوالے سے اچھی خبر آنے والی ہے۔ صدر ٹرمپ سے کس نے درخواست کی، یہ الگ موضوع ہے، لیکن اس موقع پر ٹرمپ نے ڈیل میکنگ کی مہارت دکھا دی تھی۔ اسی ڈیل میکنگ کی مہارت کی بنیاد پر شاید مودی نے ٹرمپ سے کوئی درخواست کی ہو اور ڈیل میکنگ کے ماہر صدر نے شاید اس درخواست کو نئے مفہوم پہنا کر اپنے مقصد کے لیے استعمال کرلیا ہو، غرض یہاں کسی سے کچھ بھی بعید نہیں۔

وزیراعظم عمران خان کے دورہ واشنگٹن کا دوسرا حاصل امریکی کمپنیوں کا پاکستان کی جانب رخ کرنا ہے۔ امریکی صدر نے ملاقات میں دوطرفہ تجارت کی بات کی۔ امریکی حکام کا کہنا ہے کہ زراعت اور توانائی کے شعبے میں تعاون کے امکانات موجود ہیں۔ زراعت کو سرفہرست لانے کا مقصد چین جیسی بڑی منڈی سے ہاتھ دھونے والے امریکی کسانوں کے لیے نئی منڈیاں تلاش کرنا ہے۔ چین کے ساتھ تجارتی تنازع میں امریکا کی سویابین کی برآمدات شدید متاثر ہوئی ہیں۔

توانائی کے شعبے میں جنرل الیکٹرک پہلے ہی پاکستان میں بڑے توانائی منصوبوں کے لیے ٹربائنز فراہم کرچکی ہے، اور پاکستان کی بڑھتی ہوئی توانائی کی ضروریات کے نئے منصوبوں میں بھی امریکی کمپنی کو مزید حصہ ملے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکا ایل این جی اور قدرتی گیس کے شعبوں میں بھی دلچسپی لے رہا ہے۔ امریکی کمپنیوں کے آنے سے تجارتی سرگرمیاں بڑھیں گی لیکن اہم بات یہ ہے کہ یہ تجارت تجارتی خسارے کو بڑھانے کا سبب نہ بن جائے۔ پاکستان کو برآمدات کے لیے امریکا سے تجارتی رعایتیں درکار ہوں گی جن کا اعلان نہیں ہوا۔

جہاں تک بات ہے امریکی مالی امداد کی، جو جنوری ۲۰۱۸ء میں ایک ٹویٹر پیغام کے بعد امریکی صدر نے بند کردی تھی، اس کے فوری بحال ہونے کے کوئی آثار نہیں۔

عمران خان کی وائٹ ہاؤس میں ٹرمپ کے ساتھ ملاقات سے پہلے اور بعد میں امریکی حکام نے فون پر میڈیا کو بریفنگ دی، جس میں عہدیداروں کا نام ظاہر نہیں کیا گیا لیکن امریکا کے ارادوں اور تحفظات سے میڈیا کو بروقت آگاہ کردیا گیا۔ ان بریفنگز کی روشنی میں اخذ کیے گئے نتائج کے مطابق امریکا کی طرف سے افغان امن عمل میں تعاون اور پاکستان کے اندر عسکری تنظیموں کے خلاف حالیہ کارروائیوں کو سراہا گیا، لیکن ساتھ ہی ڈومور کی فہرست بھی تھمائی گئی ہے۔

وزیراعظم کے دورہ امریکا سے پہلے کئی حوالوں سے اہم پیش رفت ہوئی۔ ۷ اور ۸ جولائی کو دوحہ میں بین الافغان مذاکرات ہوئے۔ افغان حکومت کے عہدیدار اور افغان طالبان ایک میز پر اکٹھے ہوئے۔ پاکستان نے اندرونِ ملک چند عسکری تنظیموں پر کریک ڈاؤن کیا، کچھ گرفتاریاں ہوئیں، اثاثے ضبط کیے گئے، چند مدارس سرکاری تحویل میں لیے گئے اور مدارس کے نظام میں اصلاحات کا ایک اور ڈول ڈالا گیا۔ امریکی حکام نے کھلے لفظوں میں کہا ہے کہ اگر پاکستان دہشت گردوں اور عسکریت پسندوں کے حوالے سے اپنی حالیہ سمت برقرار رکھتا ہے تو پاکستان کے ساتھ تعلقات کی بہتری اور پائیدار شراکت داری کا راستہ کھلا ہے۔

امریکی صدر کے ساتھ پریس بریفنگ میں وزیراعظم عمران خان نے خوشخبری دی کہ یرغمالیوں کے حوالے سے جلد اچھی خبر ملے گی۔ یہ یرغمالی کابل میں امریکی یونیورسٹی کے ۲ پروفیسر ہیں، جو ۲۰۱۶ء میں اغوا ہوئے تھے۔ ان میں ایک امریکی پروفیسر کیون کنگ ہے، جس کو گردوں اور دل کے عوارض لاحق ہیں۔ ان ۲ یرغمالیوں کے بدلے طالبان انس حقانی کی رہائی چاہتے تھے۔ طالبان نے انس حقانی کی رہائی کے لیے مذاکرات کے آغاز پر ان کا نام مذاکراتی ٹیم میں بھی شامل کیا تھا۔ جنوری میں دوحہ مذاکرات کا پہلا دور پروفیسروں کی رہائی کے لیے دباؤ ڈالنے پر ہی تعطل کا شکار ہوا تھا۔

یرغمالیوں کی رہائی امریکی صدر کے لیے یقیناً اچھی خبر تھی لیکن امریکیوں کا اصرار ہے کہ افغان امن عمل نازک موڑ پر ہے، پاکستان افغان طالبان پر مستقل جنگ بندی اور افغان حکومت کے ساتھ باضابطہ مذاکرات کے لیے دباؤ ڈالے اور مذاکرات کی مخالفت کرنے والے دھڑوں کو اپنی سرزمین سے نکال باہر کرے۔

امریکا فوجی انخلا پر رضامندی کے باوجود افغانستان میں اڈے برقرار رکھنا چاہتا ہے اور اس پر بھی طالبان کو رضامند

کرنے کے لیے کہا جارہا ہے۔ امریکی اڈوں کی موجودگی نہ صرف اسٹریٹجک اہمیت کی حامل ہوگی بلکہ افغان سرزمین مستقبل میں دوسرے ملکوں پر حملہ نہ کرنے کی ضمانت کا ذریعہ بھی تصور کی جارہی ہے۔

ڈومور کی بات صرف افغان امن عمل تک محدود نہیں بلکہ امریکا افغانستان اور بھارت کے درمیان تجارت کے لیے راہداری بھی کھلوانا چاہتا ہے۔ امریکی حکام کا کہنا ہے کہ یہ تجارتی راہداری کھلنے سے ہی پاکستان کی خطے میں امن کے لیے سنجیدگی ظاہر ہوگی۔ اس کے ساتھ عسکری تنظیموں کی گرفتار قیادت کے خلاف ٹھوس قانونی کارروائی کا تقاضا کیا جارہا ہے۔ امریکی حکام نجی طور پر یہ کہتے ہیں کہ گرفتاریاں پہلے بھی ہوتی رہیں، حافظ سعید کی گرفتاری ساتویں بار ہوئی، مگر اب اس میں سنجیدگی نظر آنی چاہیے۔

امریکی حکام نے سی پیک پر بھی تحفظات کا اظہار کیا اور سی پیک منصوبوں پر سرمایہ کاری اور قرضوں کو پاکستان کی خودمختاری کے خلاف قرار دیتے ہوئے ہلکی سی تنبیہ بھی کی گئی۔ اس کے ساتھ سب سے بڑا اور فوری ایشو فائیو جی ٹیکنالوجی کا ہے۔ امریکیوں کا کہنا ہے کہ ہواوے سے فائیو جی ٹیکنالوجی لینے والے اس کے مضمرات سے ضرور آگاہ رہیں۔ ہواوے کے ساتھ کاروبار کرنے والے ملکوں اور کمپنیوں کو امریکی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑسکتا ہے۔

امریکی حکام نے اسامہ بن لادن کی نشاندہی کرنے والے شکیل آفریدی کی رہائی کا بھی مطالبہ کیا۔ وزیراعظم نے فوکس نیوز سے انٹرویو میں ڈاکٹر عافیہ صدیقی کے بدلے رہائی پر غور کا بیان دیا، لیکن اسامہ کی تلاش میں پاکستان کے سیکورٹی اداروں کے کردار کا ذکر کرکے وزیراعظم نے شکیل آفریدی کے خلاف پچھلے ریاستی موقف کو بھی کمزور کردیا۔

مشکلات میں گھری پاکستانی معیشت کے لیے اس دورے سے فوری کمک دستیاب نہیں ہوسکی۔ امریکا کے کاروباری صدر نے فوری دستیاب پیشکش اور تعاون کا جواب خوش دلی سے استقبال کرکے دیا۔ ۱ء۳ ارب ڈالر سالانہ سیکورٹی امداد کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ پاکستان مزید پیشرفت دکھائے تو ممکن ہے امداد بحال کردی جائے۔ فوری فائدہ اگر ممکن ہوا تو ستمبر میں ایف اے ٹی ایف کا جائزہ اجلاس پاکستان کے اقدامات پر مثبت رپورٹ دے گا، لیکن اس کا بھی کہیں وعدہ یا بیان دیکھنے کو نہیں ملا۔

افغان امن عمل میں اشرف غنی حکومت کی حیثیت بھی اس دورے میں واضح ہوگئی۔ امریکی صدر نے جنگ کے خاتمے کے لیے بےصبری کا کئی بار اظہار کیا اور کہا کہ اگر جنگ جیتنا مقصود ہو تو ۱۰ دن لگتے ہیں لیکن وہ ایک کروڑ انسانوں کا قتل نہیں چاہتے۔ ساتھ ہی کہا کہ افغان اب عمارتیں بنا رہے ہیں، کاروبار کر رہے ہیں، اس مقصد کے لیے ہم وہاں کیوں رُکیں۔

لیکن افغانستان کو صفحۂ ہستی سے مٹادینے کے بیان پر کابل حکومت شدید غصے میں ہے، مگر کیا کیا جائے کہ کام تو اسی تنخواہ پر کرنا ہے اور وہ بھی جب تک ملازمت چلتی ہے۔

افغان امن عمل میں سب سے بڑا مسئلہ شراکتِ اقتدار کا ہے۔ افغان حکومت میں کئی لسانی گروپ اور وارلارڈز حصہ بقدر جثہ لیے بیٹھے تھے لیکن اب اگر طالبان کی واپسی ہوتی ہے تو وہ کم از کم ۷۰ فیصد کی توقع رکھتے ہیں۔ ان حالات میں کئی پرانے تنخواہ داروں کی چھٹی ہوجائے گی، یہی وجہ ہے کہ صدر ٹرمپ کو ان کی ناراضی کی پروا نہیں۔

(مضمون نگار دو دہائیوں سے زائد عرصہ سے صحافت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ بین الاقوامی تعلقات بالخصوص مشرق وسطیٰ ان کی دلچسپی کے موضوعات ہیں۔)

(بحوالہ: ’’ڈان نیوز ڈاٹ ٹی وی‘‘۔ ۲۴ جولائی ۲۰۱۹ء)

اکیسویں صدی کے اکیس سبق

گیارہواں باب

عاجزی: تم دنیا کی نگاہوں کا مرکز نہیں ہو!

اکثر لوگ یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ دنیا کا مرکز ہیں، اور اُن کی ثقافت تاریخ کی سب سے درخشاں تہذیب سے تعلق رکھتی ہے۔ بہت سے یونانی یقین رکھتے ہیں کہ تاریخ ہومر اور افلاطون سے شروع ہوئی، اس لیے سارے اہم نظریات اور ایجادات ایتھنز، اسپارٹا، اسکندریہ یا قسطنطنیہ میں ہوئیں۔ چینی قوم پرست پُرزور انداز میں کہتے ہیں کہ تاریخ دراصل زرد ایمپائر سے شروع ہوئی، Xia اور Shang شاہی خاندانوں سے معاشرے آگے بڑھے۔ جو کچھ مغربیوں، مسلمانوں اور ہندوستانیوں نے حاصل کیا، وہ چینی کامیابیوں کا پرتو تھا۔ ہندوان چینی دعوؤں کو مسترد کرتے ہیں، اور دعویٰ کرتے ہیں کہ ہوائی جہاز اور ایٹم بم بھی قدیم ہندوستان کی ایجادیں ہیں اور اُس وقت کنفیوشس، افلاطون، آئن اسٹائن، رائٹ برادرز کا کہیں کچھ پتا نہ تھا۔ مثال کے طور پر، تمہیں معلوم ہے؟ یہ مہارشی بھردواج تھے جنھوں نے سب سے پہلے راکٹ اور جہاز بنائے تھے، وشوامترا نے نہ صرف میزائل ایجاد کیے تھے بلکہ انھیں استعمال بھی کیا تھا، اچاریہ کنادا ایٹمی تھیوری کا خالق تھا، اور مہابھارت میں ایٹمی ہتھیاروں کا ذکر ہے۔

دین دار مسلمان پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے کی تاریخ کو غیر متعلق قرار دیتے ہیں۔ وہ نزول قرآن کے بعد کی تاریخ ہی کو تاریخ سمجھتے ہیں (حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم سے قبل کی تاریخ جاننے کا واحد مستند ذریعہ سوائے قرآن حکیم کوئی نہیں۔ اگر قبل از قرآن تاریخ جاننے کا کوئی مستند ذریعہ ہے؟ تو بتایا جائے؟ قرآن حکیم سے بڑی تاریخی سچائی، کائناتی سچائی اور انسانی سچائی کوئی نہیں۔ یہ کھلا چیلنج ہے۔ اگر قرآن سے زیادہ مستند اور لا مبدل ذریعہ علم کوئی ہے، تو سامنے لایا جائے! مغرب میں تو تاریخ آج تک درست اسناد سے محروم ہیں)۔ البتہ ترک، ایرانی، اور مصری قوم پرست کہتے ہیں کہ اسلام سے پہلے اُن کی قومیں انسانی تہذیب کی روحِ رواں تھیں اور اسلام کی آمد کے بعد بھی اُن ہی کی اقوام تہذیب اسلامی کی اصل جانشین ہیں۔ (مسلم دنیا میں قوم پرستی کی وبا ایک المیہ ہے، جس نے بلا شبہ شدید نقصان پہنچایا ہے۔)

یہ کہنا غیرضروری ہوگا کہ برطانوی، فرانسیسی، جرمن، روسی اور جاپانی سب ہی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اگر اُن کی قوم کے کارہائے نمایاں نہ ہوتے تو انسانیت بربریت کا شکار ہوجاتی، جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتی رہ جاتی۔ یہ سارے دعوے جھوٹے ہیں۔ یہ سب تاریخ سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ جب انسانوں نے دنیا کو اپنی نوآبادیات بنایا، اُس وقت کوئی مذہب کوئی قوم وجود نہیں رکھتی تھی (پروفیسر صاحب ڈارونسٹ ہیں۔ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ انسان بندر سے بنا ہے۔ یہ نقطۂ نظر خالصتاً ارتقا سے متعلق ہے، اور اسے عمومیت نہیں دی جاسکتی۔ اسے ہرگز قبول عام حاصل نہیں ہے)۔ ان کی پیدائش افریقا میں پتھر کے زمانے میں ہوئی۔ اس لیے انہیں کسی بھی بعد کے دور سے منسوب کرنا درست نہیں۔ اخلاقیات، فن، روحانیت اور تخلیق کی صلاحیتیں ہمارے ڈی این اے میں موجود ہیں۔ میں ذاتی طور پر اس بھدی انانیت سے مانوس ہوں، کیونکہ میرے اپنے لوگ ’یہودی‘ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ وہ دنیا کے اہم ترین لوگ ہیں۔ کسی بھی انسانی کامیابی یا ایجاد کا ذکر کریں، یہودی فوراً خود کو اس سے منسوب کردیں گے۔ میں ایک بار یہودی یوگا استاد کے پاس گیا، تو اس نے تعارفی

کلاس میں بڑی سنجیدگی سے بتایا کہ یوگا ابراہم (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کی ایجاد ہے۔ عبرانی کے حروف تہجی کی صورتوں میں یوگا کا ہر انداز موجود ہے۔ ابراہم نے جنہیں یوگا سکھائی، وہ بھارت گئے اور ہندوؤں کو یوگا سکھائی۔ جب میں نے اُن سے اس بات کا ثبوت مانگا، تو انہوں نے کتاب مقدس کا ایک پیراگراف پڑھ کر سنا دیا، جس میں اس بات کا ذکر تھا کہ ابراہم نے اپنے بیٹوں کو تحفے دے کر مشرق کی جانب بھیجا تھا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں وہ کیا تحفے تھے؟ آرتھوڈکس یہودیوں میں یہ عقیدہ عام ہے کہ اگر ربی مقدس صحیفوں کی تلاوت ترک کر دیں تو کائنات کا شیرازہ بکھر جائے۔ اگر کوئی اس عقیدے کو چیلنج کرے تو وہ نرا جاہل بے وقوف قرار دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ سیکولر یہودی بھی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ انسانی تاریخ کے ہیرو ہیں۔ میں یہاں یہودیت کی افضلیت کے بے بنیاد دعووں کی قلعی کھولوں گا اور یہ قاری پر چھوڑ دوں گا کہ وہ اپنے گروہ کی خود پسندی کے غبارے سے خود ہوا نکالے۔

فرائڈ کی ماں

میری کتاب سیپئنز: انسانیت کی مختصر تاریخ پہلی بار عبرانی میں لکھی گئی، یہ اسرائیلی شہریوں کے لیے تھی۔ پہلی اشاعت کے بعد جن سوالوں سے میرا سب سے زیادہ سامنا ہوا، وہ یہ تھے کہ: مذکورہ تاریخ میں یہودیت کا ذکر سرسری سا ہے، کیوں؟ عیسائیت، اسلام اور بدھ مت پر بہت زیادہ لکھا گیا ہے، کیوں؟ تاریخ میں یہودیت کے عظیم کردار کا ذکر کیوں نہ کیا گیا؟ کیا اس کتاب کا کوئی سیاسی ایجنڈا ہے؟ یہ سوال فطری تھے، کیونکہ اسرائیلی یہودی کنڈرگارٹن سے یہی سیکھتے ہیں کہ وہ انسانی تاریخ کے ہیرو ہیں۔ اسرائیلی طلبہ بارہ سال تک مطالعہ میں عالمی تاریخ کی بمشکل ہی کوئی بھنک پاتے ہیں۔ ان کی تعلیم عہد نامہ قدیم سے شروع ہوتی ہے؛ یہ دربدری سے صہیونیت کے عروج پر پہنچتی ہے؛ یہاں سے ہولوکاسٹ اور پھر قیام اسرائیل تک پہنچتی ہے۔ جب اسرائیلی طلبہ اسکول سے فارغ التحصیل ہوتے ہیں، اُن کے نزدیک تاریخ بس یہی کچھ ہوتی ہے۔ سلطنت روما اور فرانسیسی انقلاب کا ذکر بھی یہ جاننے کے لیے کیا جاتا ہے کہ ان مراحل پر 'یہودیوں' کے ساتھ کیا معاملہ روا رکھا گیا۔ انہیں چین، بھارت اور افریقا کے بارے میں کچھ نہیں پڑھایا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہودیت نے انسانی تاریخ میں معمولی کردار ادا کیا ہے۔ عیسائیت، اسلام اور بدھ مت جیسے کائناتی مذاہب کے مقابلہ میں یہودیت کی حیثیت قبائلی عقیدہ سے زیادہ نہیں۔ اس کا سارا ارتکاز چھوٹی سی قوم اور چھوٹی سی زمین کی تقدیر پر ہے۔ دیگر ملکوں میں کیا ہو رہا ہے، یہ ان کا درد سر ہی نہیں۔ مثال کے طور پر، انہیں اس بات کی کم ہی پروا ہے کہ جاپان یا برصغیر میں کیا حالات و واقعات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا تاریخی کردار بہت کم ہے (یہودیوں کا تاریخی کردار ہرگز معمولی نہیں، البتہ یہ غیر معمولی کردار تعمیری نہیں تخریبی ہے۔ شاید اسی وجہ سے پروفیسر صاحب کے معیار ترقی پر یہودیت کا کردار پورا نہ اترا ہو)۔ یہ سچ ہے کہ یہودیت نے عیسائیت کو جنم دیا اور اسلام کی پیدائش پر یہ اثر انداز ہوا۔ تاہم عیسائیت اور اسلام کی عالمی کامیابیاں اُن کی اپنی ہیں۔ یہودیت کا کردار فرائڈ کی ماں جیسا ہے۔ اچھا یا بُرا، سگمنڈ فرائڈ کا جدید مغرب کی سائنس، ثقافت اور آرٹ پر گہرا اثر ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ اگر فرائڈ کی ماں نہ ہوتی تو فرائڈ بھی نہ ہوتا، اور نہ اُس کی کوئی شخصیت ہوتی، نہ اس کے ارادے ہوتے اور نہ منفرد خیالات ہوتے۔ مگر جب کوئی جدید مغرب کی تاریخ پر لکھنے کا ارادہ کرے، تو کیا اُس سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ فرائیڈ کی ماں پر پورا باب لکھے؟ بالکل اسی طرح، یہ بات درست ہے کہ یہودیت کے بغیر عیسائیت کا کوئی وجود نہیں، مگر دنیا کی تاریخ لکھتے ہوئے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ عیسائیت نے یہودی میراث کے ساتھ کیا کیا؟ یہ بھی سچ ہے کہ اپنی مختصر سی تعداد کے باوجود یہودیوں نے آخری دو ہزار سالوں کی تاریخ پر لامحدود اثرات مرتب کیے۔ مگر جب آپ تاریخ کے مکمل منظر نامے پر نظر ڈالتے ہیں تو یہودیت کی شراکت داری بہت محدود نظر آتی ہے۔ انسانوں نے پوری دنیا میں بود و باش اختیار کی، زراعت اپنائی، ابتدائی شہر تعمیر کیے، طرز تحریر ایجاد کیا اور پیسے کا استعمال وضع کیا۔ یہ سب یہودیت کے ظہور سے ہزاروں سال پہلے ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ اگر آپ گزشتہ دو ہزاریوں کا جائزہ لیں، اسے چینی اور ریڈ انڈینز کے تناظر میں بیان کریں تو شاید ہی کوئی یہودی کارنامہ نظر سے گزرے۔ یہودیوں کا چینی سلطنت کی تعمیر میں، یورپی سمندری مہمات میں، صنعتی انقلاب میں، یا جمہوری نظام کے استحکام میں کوئی قابل ذکر کردار نہیں ہے۔ پرنٹنگ پریس ہو یا اسٹیم انجن سب غیر یہودیوں کی ایجادیں ہیں۔ عیسائیت کے ماننے والے سب سے زیادہ ۲٫۳ ارب ہیں، مسلمانوں کی تعداد ۱٫۸ ارب ہے جبکہ یہودی صرف ڈیڑھ کروڑ ہیں۔ ہندو مذہب کے ایک ارب معتقد ہیں اور بدھ مت کے پچاس کروڑ ماننے والے ہیں۔ ڈھائی کروڑ سکھوں اور پانچ کروڑ شنتو معتقدین کا تو ذکر ہی کیا! یہودی پیغمبروں کی اخلاقیات بھی کوئی انوکھی شے نہ تھی۔ یہ اخلاقی اصول سمیری شہروں میں بھی رائج تھے۔ فرعون کے مصر اور بابلیوں میں بھی اخلاقیات پائی جاتی تھیں۔ بادشاہ حمورابی نے یہودی پیغمبروں سے بہت پہلے ریاستی قوانین متعارف کروا دیے تھے، ان میں اخلاقیات بھی موجود تھیں۔ ہندوستان میں مہاراجہ اشوک نے تیسری صدی قبل مسیح میں محبت اور اخلاقیات کا درس دیا۔

یہودی فزکس، عیسائی بائیولوجی

صرف انیسویں اور بیسویں صدی میں یہودیوں کی غیر معمولی کاوشیں سامنے آتی ہیں۔ خاص طور پر جدید سائنس میں یہودی کردار حیرت انگیز ہے۔ بیس فیصد نوبیل انعام یافتہ سائنس دان یہودی ہیں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان کامیابیوں میں انفرادی کوششوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ اہم ترین یہودی سائنس دانوں نے جو کچھ کیا، مذہبی دائرے سے باہر رہ کر کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہودیوں کی سائنسی کامیابیاں اس لیے انجام پائیں، کہ وہ عبادت گاہوں سے نکل کر لیبارٹریز میں جا پہنچے تھے۔ ۱۸۰۰ عیسوی سے پہلے یہودیوں کی سائنسی کامیابیاں محدود تھیں۔ یہ عظیم تبدیلی یہودیوں کی سیکولرائزیشن کے بعد ہی ممکن ہوئی۔ جس وقت نیوٹن اور گیلیلیو سائنسی انکشافات کر رہے تھے، آئن اسٹائن کے دادا پردادا تالمود پڑھنے میں مگن تھے۔ حیاتیاتی نظریۂ ارتقا چارلس ڈارون کا کارنامہ تھا، جو عیسائی تھا۔ اسی طریقے سے تاریخ کا دھارا بدلنے والے حیاتیاتی نظریات عیسائی سائنس دانوں کی کاوشیں تھیں۔

اس سے پہلے کہ مجھ پر سامی مخالف ہونے کا الزام لگا دیا جائے، واضح کر دوں کہ میں یہودیت کو کسی بُرائی کے طور پر پیش نہیں کر رہا۔ بلکہ صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ تاریخ میں اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ عموماً سامی مخالف سمجھتے ہیں کہ یہودیوں نے پوری دنیا کا نظام سنبھالا ہوا ہے، بینکنگ نظام ان کے ہاتھوں میں ہے، ذرائع ابلاغ ان کی مٹھی میں ہے، اور عالمی حدت سے لے کر نائن الیون حملوں تک، ہر واقعہ کا ذمے دار انہیں ٹھہرایا جاتا ہے۔ یہ سب ویسی ہی حماقت ہے کہ جیسی یہودیوں کو اپنی اہمیت کے حوالے سے لاحق ہے۔

تمام مذاہب کے لیے عاجزی ضروری ہے، علم درکار ہے۔ سب سے بہترین عجز وہ ہے، جو خدا کے سامنے کیا جائے۔ جب جب وہ خدا سے ہم کلام ہوتے ہیں، عاجزی کا اظہار کرتے ہیں، مگر پھر اُسی خدا کا نام لے کر اپنے بھائیوں پر مسلط ہو جاتے ہیں۔

(کتاب: ''اکیسویں صدی کے اکیس سبق''۔ ترجمہ و تلخیص: ناصر فاروق)

شام کی خانہ جنگی۔۔حتمی مرحلہ یا ایک نیا آغاز۔۔

(دوسری قسط)

Robert S. Ford

ایران کا کردار:

اسد کا روس سے بھی زیادہ با اعتماد ساتھی ایران رہا ہے، اور اسی نے اس پوری جنگ میں سب زیادہ افرادی قوت فراہم کی ہے اور اسی مدد کی وجہ سے شام مستقل اس جنگ کو لڑنے کے قابل ہوا۔ ۲۰۱۳ء میں جب بشار الاسد کی گرفت کمزور پڑ رہی تھی تو ''حمص'' کی فتح کے لیے ایران نے لبنانی تنظیم ''حزب اللہ'' کو میدان میں اتار دیا، جس سے اس لڑائی کا پانسہ ہی پلٹ گیا اور بشار الاسد نے دوبارہ کنٹرول حاصل کر لیا۔ ۱۵-۲۰۱۴ء میں پاسدارانِ انقلاب کے خفیہ ونگ ''القدس فورس'' نے عراقی شیعہ عسکریت پسند تنظیموں کے ارکان کو لڑنے کے لیے شام بھیجا۔ ''القدس'' نے افغانی اور پاکستانی شیعہ گروہوں کو بھی شام بھیجنے کے لیے منظم کیا۔ ۲۰۱۵ء سے ۲۰۱۸ء کے دوران جو فتوحات شامی حکومت نے حاصل کیں اس میں ان گروہوں نے بڑا کردار ادا کیا۔ بیرونی تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ ایک اندازے کے مطابق ایران نے تقریباً ۸۰ ہزار افراد اس جنگ کے لیے مہیا کیے۔ اور القدس کے زیر نگرانی فراہم کی گئی یہ افرادی قوت شام کی سرحدی فوج میں مکمل طور پر ضم ہو گئی اور اس سرحدی فوج کے کنٹرول اور کمانڈ میں اہم کردار ادا کیا۔

ایران کا بنیادی مقصد بشار الاسد حکومت کو گرنے سے بچانا تھا، جس کے بدلے میں ایرانی حمایتی لبنانی تنظیم ''حزب اللہ'' کو تزویراتی فوائد حاصل ہوتے اور اسرائیل کے خلاف ''فرنٹ لائن'' مضبوط ہو جاتی (اس طرح ایران اسرائیل کے براہ راست حملوں سے بھی بچا رہتا) اور اسرائیل سے نچلے درجے کے تصادم کی وجہ سے ایران کی خطے میں مرکزی حیثیت بھی قائم رہتی۔ ایرانی حکومت اس بات پر مستقل زور دیتی رہی ہے کہ اس کی زیر نگرانی ملیشیا کا شام میں رہنا ضروری ہے، اس کے ساتھ ہی ایران نے شام میں امریکی فوج کے مستقل قیام اور امریکا کی جانب سے عرب عسکریت پسندوں کی امداد کی بھی شدید مخالفت کی۔ نقصانات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی ایران کو زیادہ نقصانات کا سامنا نہیں کرنا پڑا، بلکہ انسانی وسائل تو عراق، لبنان، افغانستان اور پاکستان کے استعمال ہوئے، جہاں سے عسکریت پسند ایران کی زیر نگرانی اس جنگ کا ایندھن بنے۔ اگرچہ ایران کے مشکل معاشی حالات، جس کی بڑی وجہ تیل کی درآمد میں کمی ہے، نے اسے شام میں اپنی سرگرمیاں محدود کرنے پر مجبور کر دیا ہے لیکن وہ شام میں اپنی موجودگی برقرار رکھنے کے لیے پرعزم ہے۔

روس:

۲۰۱۵ء میں جب روس نے اپنے آخری عرب اتحادی شام کی مدد کا آغاز کیا، تو اس کا مقصد یہ تھا کہ بشار حکومت کے خاتمے کے نتیجے میں ہونے والے نقصان سے بچنے کی کوشش کی جائے۔ ۲۰۱۶ء میں روس نے شامی فوج کی بھرپور فضائی اور زمینی مدد کر کے جنگ کا پانسہ پلٹنے میں اہم کردار ادا کیا۔ پوٹن نے شام میں دخل اندازی کر کے مغربی ممالک کو بھی بہت سے پیغامات دیے۔ روس نے آمرانہ طرزِ حکومت کے خاتمے کے لیے غیر ملکی طاقتوں کی جانب سے حزب اختلاف کے استعمال کو یکسر مسترد کر دیا۔ اس طرح روس نے شام میں سرخ لائن لگا کر مغرب کو یہ واضح کر دیا کہ ایسے تمام ممالک جو کبھی نہ کبھی روس میں شامل ہو جائیں گے۔ وہاں وہ کسی قسم کی مغربی مداخلت برداشت نہیں کرے گا۔ پوٹن کو حوالے سے کسی قسم کا ابہام نہیں تھا کہ اس مدد کے نتیجے میں بشار حکومت قائم رہے گی۔ دوسری اہم بات یہ کہ روس اس بات پر مستقل زور دیتا رہا ہے کہ شام سے غیر ملکی فوج کا انخلا ہونا چاہیے (سوائے روسی فوج کے)۔

پوٹن شامی جنگ میں مداخلت پر داخلی دباؤ کے حوالے سے کافی حساس تھے، اسی لیے انھوں نے روسی فوجی امداد کو فضائی آپریشن اور چند مقامات پر زمینی فوج بھیجنے تک محدود رکھا، اس کے برعکس مالی لحاظ سے بھرپور مدد جاری رکھی۔ اس طرح یہ ساری کوششیں روس کے لیے زیادہ مہنگی ثابت نہیں ہوئیں۔ دوسری طرف ماسکو نے اس جنگ میں شامل تمام غیر ملکی فریقین سے بھی رابطوں کو برقرار رکھا، ان فریقین میں اسرائیل، ترکی، ایران شامل ہیں، یہی وجہ ہے کہ خانہ جنگی کو رکوانے کے لیے ہونے والے مذاکرات میں روس کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ماسکو نے ترکی اور ایران کو ملا کر ''آستانہ گروپ'' کے نام سے ایک فورم تشکیل دیا، تاکہ زمینی لڑائی کو کم کیا جا سکے (جس سے بالواسطہ بشار حکومت کو ہی فائدہ ہوا)۔ روس چاہتا ہے کہ آستانہ گروپ اقوام متحدہ کے ساتھ مل کر اس خانہ جنگی کا کوئی سیاسی حل نکالا جائے۔ اہم بات یہ ہے کہ روس کو یہ ایڈوانٹیج حاصل تھا کہ شامی حکومت کا مقابلہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار حزب اختلاف سے تھا اور ان سے لڑنے کے لیے صرف شامی فوج اکیلی نہ تھی بلکہ امریکی اور ترک فوج بھی زمین پر موجود تھی۔

شمالی شام کا خطہ ترک قبضے میں:

جنگ کے آغاز میں تو ترکی کو اس بات کا یقین تھا کہ شامی حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا اور حزب اختلاف میں موجود اس کے اتحادی خاص طور پر ''اخوان'' سے تعلق رکھنے والے گروہ اس جنگ میں حاوی ہو جائیں گے۔ تاہم ۲۰۱۵ء میں روسی مداخلت اور امریکا کی جانب سے داعش کے خلاف لڑائی کے لیے کردوں کے استعمال کی وجہ سے بشار کی حکومت کو کافی حد تک استحکام حاصل ہو گیا۔ جس کی وجہ سے ترکی کو اپنے مقاصد تبدیل کرنا پڑے، اب ترکی کو صرف اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں شمالی شام میں کردوں کی ریاست قائم نہ ہو جائے۔ شامی کردوں کی تنظیم YPG ترک کردوں کی تنظیم ''کردستان ورکرز پارٹی'' سے مسلسل رابطوں میں تھی، اس کے باوجود امریکا نے YPG کی مستقل حمایت جاری رکھی۔ امریکا کے اس اقدام نے ترکی کو روس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ ترکی نے شمالی شام کے سرحدی علاقوں اور بحیرہ روم کی طرف YPG کی پیش قدمی روکنے کے لیے زمینی مداخلت کی تو روس نے کسی قسم کی مزاحمت نہ کی۔ یعنی روس نے ترکی کی اس حکمت عملی کو تسلیم کر لیا۔

ادلب اور آفرین میں تعینات کیے جانے والے سیکڑوں ترک فوجیوں کے دو مشن تھے۔ پہلا یہ کہ شام میں موجود اپنے اتحادیوں کی مدد سے شامی کردوں کے شمالی شام میں بڑھتے ہوئے کنٹرول اور ان کی پیش قدمی کو روکا جائے۔ انقرہ پہلے ہی ۳۵ لاکھ مہاجرین کا بوجھ سنبھالے ہوئے ہے، اس لیے اس نے اپنی فوج کو یہ مشن سونپا کہ وہ ادلب میں شامی فوج کی پیش قدمی کو روکے تاکہ وہاں سے مزید لوگ ہجرت کر کے ترکی کی طرف نہ آئیں۔

لہٰذا ترکی ماسکو کو بار بار یہ تسلی کرواتا رہا ہے کہ ادلب میں عسکری کارروائیوں میں بتدریج کمی آ رہی ہے، تاکہ ماسکو اور دمشق یہاں کسی بھی مشترکہ کارروائی سے گریز کریں۔ اگرچہ شامی حکومت مسلسل یہاں بھاری ہتھیاروں سے گولہ باری کرتی رہی ہے لیکن کوئی بڑا حملہ ابھی تک نہیں کیا۔ ماسکو بھی مستقل اس بات کی کوششیں کرتا رہا ہے کہ انقرہ سے اس کے

تعلقات بہتر ہوتے چلے جائیں۔ ترکی اس وقت بہت نازک پوزیشن پر کھڑا تھا، نہ ہی وہ پہلے سے موجود ۸ ملین مہاجرین کی تعداد میں اضافہ چاہتا تھا اور نہ ہی وہ امریکا سے خراب تعلقات کے ہوتے ہوئے روس سے تعلقات بگاڑ سکتا تھا۔

شام کی غیر عسکری حزب اختلاف:

غیر مسلح حزب اختلاف کا قیام ۲۰۱۱ء میں حکومت کی طرف سے مظاہرین پر تشدد کی وجہ سے عمل میں آیا، پولیس اور فوج کے جوان اور افسران حکومت کے اس رویے کی وجہ سے اپنی ملازمتیں چھوڑ کر ان مظاہرین میں شامل ہو گئے۔ شامی حزب اختلاف کے درمیان ہمیشہ سے سیکولر اور مذہبی کی تقسیم رہی ہے۔ اسی لیے یہ لوگ کبھی بھی مستقبل کے مسئلے پر اتفاق نہیں کر پاتے۔ اسی طرح اسلامی عسکری گروہوں میں تقسیم بھی موجود ہے، ان میں چند لوگوں کا کہنا ہے کہ حکومت سے بات کر لینی چاہیے، جب کہ کچھ جہادی گروہ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ حکومت کے خلاف جہاد جاری رہنا چاہیے، جب تک کہ اسلامی حکومت کا قیام عمل میں نہیں آجاتا۔

حزب اختلاف کے ایسے تمام گروہ جو غیر جہادی تو ہیں لیکن مسلح ہیں، وہ ترک فوج کی نگرانی میں کام کر رہے ہیں۔ ان کی فعالیت شمال مغربی صوبے ادلب اور آفرین کے علاقوں میں ہے۔ ان گروہوں کا ایک کمزور سا اتحاد ''نیشنل لبریشن فرنٹ'' کی صورت میں موجود ہے۔ ترک آرمی کی پراکسی ہونے کی وجہ سے یہ سب گروہ مکمل طور پر ترک آرمی پر ہی انحصار کرتے تھے، اور ترک آرمی بھی ان کو شامی حکومت سے لڑوانے کے بجائے شامی کردوں سے ان کا مقابلہ کرواتی تھی۔ یہ غیر جہادی گروہ اکثر جہادی گروہوں سے بھی لڑ جاتے تھے، لیکن ان کو ایسی تمام لڑائیوں میں شکست کا ہی سامنا کرنا پڑا۔ زمینی لڑائی میں ان کی کمزوریوں ہی کی وجہ سے ترکی کو ادلب میں بڑی کارروائی میں مشکل کا سامنا رہا۔

شامی جہادی حزب اختلاف:

شام میں لڑنے والی سب سے اہم جہادی تنظیم ''ہیئۃ تحریر الشام'' (HTS) ہے، جو کہ اب بھی شام کے کچھ علاقے پر قابض ہے۔ ادلب اور آس پاس کے علاقوں میں HTS ہی سب سے طاقتور تنظیم رہی ہے۔ HTS بنیادی طور پر ''نصرہ فرنٹ'' سے بننے والی ایک تنظیم ہے، جو کہ عراقی تنظیم کی ایک شاخ تھی۔ HTS سیاسی طور پر اپنی mother تنظیم سے بہت آگے تھی۔ اس تنظیم نے جہاں ضرورت محسوس کی دیگر جہادی تنظیموں سے اتحاد بنائے اور جب چاہا اس اتحاد کو توڑ دیا۔ ادلب کے بڑے حصے میں یہ تنظیم سرکاری اداروں، اسکول اور اسپتالوں کا کنٹرول سنبھالے ہوئے ہے۔ HTS یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اس کا القاعدہ سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن امریکا اس دعوے کو مسترد کرتے ہوئے اسے دہشت گرد تنظیم قرار دے چکا ہے۔ ۲۰۱۳ء سے ادلب کے ترک سرحد سے ملنے والے سرحدی علاقوں پر HTS کا مکمل کنٹرول ہے اور یہ ان کے لیے آمدن کا ایک بڑا ذریعہ بھی، کیونکہ وہ ہر آنے جانے والے ٹرک سے ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ ان کے کارکنان بہت بہادر اور تجربہ کار ہیں اور ان کی قیادت بھی سیاسی بصیرت کی حامل ہے۔ شامی حکومت ادلب کا کنٹرول حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی ہے لیکن ایسا روس کی فضائی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہوگا۔ ادلب کے مستقبل کا انحصار روس ترکی مذاکرات پر ہے اور یہ مذاکرات صرف ادلب کے متعلق نہیں ہیں۔ ادلب اس وقت تک لڑائی کا مرکز رہے گا جب تک شام، ترکی اور روس کے درمیان کوئی واضح ڈیل نہیں ہو جاتی۔

مشرقی شام، امریکی قبضے میں:

گزشتہ عرصے میں امریکا نے شامی حکومت کے خاتمے کے ہدف کو تبدیل کر کے شام سے داعش کے خاتمے کو اپنا ہدف بنا لیا اور ۲۰۱۹ء تک امریکی اہداف شمالی شام میں اپنے اتحادیوں کی حفاظت، ایرانی اثر و رسوخ میں کمی اور اسد حکومت کو معاشی طور پر کمزور کرنے میں تبدیل ہو چکے تھے۔ صدر ٹرمپ کو اس بات کی جلدی تھی کہ امریکا کی فتح کا اعلان کیا جائے اور شام میں اپنی ''کمٹمنٹ'' کم کی جائے، اسی لیے انھوں نے پینٹاگون اور اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ پر دباؤ ڈال کر امریکی فوج کی واپسی کا اعلان کر دیا۔ صرف چند سو فوجی دریائے فرات کے مشرق میں قائم کیے گئے نوفلائی زون میں باقی رکھنے کا اعلان کیا۔ تاکہ داعش کی دوبارہ سر اٹھانے کوششوں کو ناکام بنایا جا سکے۔ لیکن ان کا درحقیقت فوج کی موجودگی کا مقصد YPG,PYD جیسی تنظیموں اور ان سے جڑے مقامی حکومتی اداروں کا تحفظ تھا۔ ابھی تک امریکا شام کی شمال مشرقی سرحد اور ترکی کے سرحدی علاقوں میں YPG اور ترکی کے درمیان مذاکرات کروا کر سیکورٹی زون بنوانے میں ناکام رہا ہے۔ امریکیوں نے شام کے ایک صحرا پر بھی اپنا کنٹرول برقرار رکھا ہوا ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں شام، اردن اور عراقی سرحدیں ملتی ہیں، اس علاقے پر قبضے کا مقصد ایران کی عراق سے آنے والی سڑک تک رسائی کو روکنا ہے۔

امریکی حکمت عملی کی اپنی کمزوریاں ہیں۔ جیسا کہ شام میں داعش کا تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے، اس لیے اقوام متحدہ کے قوانین کے مطابق امریکا کے پاس شام میں مزید قیام کی کوئی ٹھوس وجہ موجود نہیں۔ ایسے میں یہاں مزید قیام امریکا کے لیے مسائل کا باعث بنے گا۔ مشرقی شام معاشی طور پر مستحکم نہیں اور ٹرمپ انتظامیہ کسی بھی طویل مدتی معاشی امداد کے معاہدے کا حصہ نہیں بننا چاہتی۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لیے امریکا نے خلیجی ممالک سے مالی امداد کروائی۔ لیکن جیسے جیسے بشار کی فوجیں مختلف علاقوں پر اپنا کنٹرول قائم کرتی جا رہی ہیں اور حالات نارمل ہوتے جا رہے، ویسے ویسے بیرونی امداد کا حصول بھی مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ امریکا کے لیے یہ بھی ممکن نہیں رہے گا کہ وہ داعش کے خلاف جنگ سے سیاسی فوائد حاصل کریں اور کرد علاقے کی خودمختاری کے لیے بشار پر دباؤ ڈالنے کی پوزیشن میں بھی نہیں رہے گا۔ بلکہ امریکا وہاں ہونے والے سیاسی اصلاحات سے متعلق مذاکرات سے بھی باہر ہو گیا ہے، ان مذاکرات میں روس، ترکی، ایران اور اقوام متحدہ شامل ہیں۔ واشنگٹن کا کردار بس اتنا رہ گیا ہے کہ وہ اپنی اتحادی تنظیموں PYD اور YPG کو اس بات سے روکے رکھے کہ وہ بشار حکومت سے امریکی رضامندی کے بنا کوئی مذاکرات نہ کریں۔ اس کے برعکس دمشق YPG اور PGD کے کچھ مطالبات اس شرط پر ماننے کے لیے تیار ہے کہ وہ بھی امریکی فوج کے انخلا کی حمایت کریں۔ اگر ایسا ہوا تو امریکا کے لیے دریائے فرات کے مشرق میں فوج کی موجودگی برقرار رکھنا ممکن نہ رہے گا۔ اسی طرح جتنا طویل عرصہ وہ شام کے مشرقی حصے میں رہیں گے اتنے ہی مسائل بڑھتے چلے جائیں گے، کیوں کہ وہاں موجود عسکری تنظیموں اور دیگر خفیہ ایجنسیوں کو امریکی سیکورٹی کے حوالے سے معلومات میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا جس کے باعث ان کے لیے امریکی فوج کو نشانہ بنانا آسان ہو جائے گا۔

منبج جو کہ خاصا پُرامن شہر تصور کیا جاتا ہے، وہاں جنوری ۲۰۱۹ء میں ہونے والے خودکش حملے میں چار امریکی ہلاک ہوئے اور یہ حملہ آنے والے مشکل حالات کی طرف واضح اشارہ دے رہا ہے۔

PYD اور YPG:

شامی کردوں کی سیاسی جماعت PYD شام کے مشرقی حصے پر ۲۰۱۳ء سے اپنا کنٹرول قائم رکھے ہوئے، اس قبضے کو قائم رکھنے میں اہم کردار اسی تنظیم کے منظم عسکری ونگ YPG کا ہے۔ امریکا نے جب داعش کے خلاف لڑنے کے لیے

شام میں مداخلت کی اور YPG کی حمایت کی تو واشنگٹن نے YPG پر دباؤ ڈال کر ان کے ساتھ عرب قبائلیوں کو بھی اس لڑائی میں شامل کیا، اور Syrian Democratic Forces کے نام سے اتحاد تشکیل دیا۔ اگرچہ اس اتحاد میں اہم کردار YPG ہی ادا کر رہی تھی۔ یہ تنظیم جمہوریت کی زیادہ حامی نہیں ہے بلکہ مشرقی شام کے وہ علاقے جو ان کے کنٹرول میں ہیں وہاں یہ سیاسی مخالفین کو اپنے دباؤ میں رکھنے کے لیے مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں اور وہاں کے حکومتی اداروں کو بھی اپنے دباؤ میں رکھتے ہیں۔

YPG اور PYD کے ترک تنظیم PKK کے ساتھ تنظیمی روابط ہیں اور اس تنظیم کو ترکی اور امریکا دونوں نے دہشت گرد قرار دے رکھا ہے۔ اہم بات یہ ہے SDF کے رہنما ''جنرل مظلوم'' جو کہ YPG کے عسکری کمانڈر بھی ہیں، مسلسل PKK سے رابطے میں ہیں۔ ترکی مستقل امریکا پر دباؤ ڈال رہا ہے کہ PYD اور YPG سے اپنے آپ کو دور رکھے۔ اس کے ساتھ ہی جنوری ۲۰۱۸ء میں ترکی نے شامی کرد علاقے آفرین پر حملہ کر کے اس بات کا بھی اظہار کر دیا کہ وہ PYD اور YPG کے معاملے میں کوئی رعایت نہیں برتے گا۔ ۲۰۱۸ء کے اختتام اور ۲۰۱۹ء کے آغاز میں جہاں امریکا شام سے نکلنے کے حوالے سے ابہام کا شکار تھا وہیں PYD اور YPG کو بھی اس بات کا خطرہ تھا کہ امریکا کے جانے کے بعد اس کی حمایت بھی بند ہو جائے گی، جس کے بعد ترکی سے نمٹنا اس کے لیے مشکل ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس تنظیم نے شامی حکومت اور روس سے بھی تعلقات برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے تاکہ وہاں سے کچھ مدد مل سکے، لیکن بشار حکومت انھیں علاقائی خودمختاری جیسی کوئی رعایت دینے کے لیے تیار نہیں۔

(ترجمہ: حافظ محمد نوید نون)

"The Syrian civil war a new stage, but is it the final one?" ("mei.edu." April 2019)

سیرتؐ کے موضوع پر اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ کتاب

اوراقِ سیرت ﷺ

مولانا سید جلال الدین عمری

قیمت: ۴۰۰ روپے

لکیٹمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5

فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون: 021-36809201

آسام: غیر قانونی شہریوں کی تلاش

مسلمانوں کی آبادیاں نشانے پر

بھارت کے وزیر داخلہ امیت شاہ نے کہا ہے کہ بھارت کے وجود کے لیے غیر قانونی شہریوں کی حیثیت دیمک اور گھس بیٹھیوں (infiltrator) کی ہے۔ حکومتِ ہند اِن کو تلاش کر کے سمندر میں پھینکے گی۔ مقامی سیاست دان کی جانب سے غیر قانونی شہریوں کے معاملے پر بدقسمتی سے یہ روایتی اُبال نہیں۔ گزشتہ سال بھارت کی سرکار نے ۳ کروڑ ۳۰ لاکھ کی آبادی پر مشتمل آسام کے بارے میں غیر قانونی شہریوں کی ایک فہرست جاری کی تھی، جس میں چالیس لاکھ غیر قانونی شہریوں کی تعداد بتائی گئی تھی جن کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ غیر ملکی ہیں اور ان کے پاس یہاں رہنے کا کوئی اختیار نہیں۔ اس کے بعد ماہِ جون میں مزید ایک لاکھ افراد کی تعداد بتائی گئی۔

امیت شاہ کا اصرار ہے کہ ان تمام غیر ملکیوں کو ملک بدر کیا جائے گا۔ بنگلا دیش سے جو لوگ یہاں ہجرت کر کے آئے ہیں انھیں بھی برداشت نہیں کیا جائے گا۔ ان میں اکثریت مفلوک الحال اور غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باعث ہندوستانی شہریت حاصل کرنے کے پیچیدہ قوانین پر پورا نہیں اُتر سکتے۔ اگر بڑے پیمانے پر ملک بدری عمل میں نہ آئی تو انھیں پردیسی قرار دینا یا انھیں حراستی کیمپ میں رکھنا نہ تو انصاف پر مبنی ہوگا بل کہ ملکی استحکام کے لیے بھی یہ سب کچھ خطرہ ہوگا۔ غیر قانونی شہریوں کی بڑی تعداد وہ ہے جو مسلمان ہے۔ ہندوستانی ریاست سے ایسے افراد کو نکالنے کا فیصلہ ہندو مسلم فسادات کی صورت میں بھی سامنے آسکتا ہے جیسا کہ ۲۰۱۲ء میں ہوا، جب چار لاکھ افراد کو بے دخل کیا گیا تھا۔ آسام میں غیر قانونی شہریوں کے تعلق سے چلائی جانے والی تحریک کو امیت شاہ ایک کامیابی کے طور پر دیکھتا ہے اور یہی اندازہ پورے ملک میں بھی دہرانا چاہتا ہے۔

ہندوستان کے جنوب میں بسنے والی آسامی آبادی کی بہت عرصے سے یہ شکایت ہے کہ وہ اپنے ہی وطن میں بنگالی مہاجرین کی وجہ سے دھنس چکے ہیں۔ نوآبادیاتی وقتوں میں ان غریب بنگالیوں پر مشتمل آبادی کا یہ بہاؤ بہتر زندگی کی تلاش میں یہاں آیا تھا کیوں کہ اس وقت ملکی سرحدوں کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔ آسام کے شہری ماضی سے آج تک بنگلا دیشی آبادی کے بڑھتے رجحان پر معترض رہے ہیں کیوں کہ بنگالی مسلمانوں کے لیے علاحدہ وطن بن چکا ہے جسے بنگلا دیش کہتے ہیں۔

آسام کی تنہائی آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ یہاں کی بود و باش میں تبدیلی کی بڑی وجہ اُس بنگالی آبادی کے یہاں بچوں کے پیدائش کی بڑھتی شرح ہے جو آسام میں پہلے سے موجود ہیں۔ بھارتیہ جنتا پارٹی جس کی حکومت آسام اور مرکز دونوں جگہ ہے وہ بھی اپنے اس وعدے کو پورا نہ کر سکی جس میں اس نے کہا تھا کہ وہ غیر قانونی شہریوں کو گرفتار کریں گے۔

حکومت جس قانون کا سختی سے اطلاق چاہتی ہے، اس میں ہر شہری کو یا اس کے آباواجداد کو ۲۴ مارچ ۱۹۷۱ء سے پہلے یہاں موجودگی کا ثبوت دینا ہوگا۔ کسانوں اور پھیری پر مامور مزدور خواتین کے لیے یہ ایک بڑا مسئلہ ہوگا۔ ان میں اکثر غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ اس بارے میں حکومت کی جانب سے متعدد غلطیاں ہوتی رہی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک اعزازیافتہ جنگی ہیرو کو غیر ہندوستانی قرار دیا گیا ہے۔ بھارتی حکومت ۱۰۰ غیر ملکی ٹریبونلز کرنے کا ارادہ رکھتی ہے جو اُس ۶۰ فیصد آبادی کے لیے موجود ہی نہیں، جسے غیر ہندوستانی قرار دیا جا چکا ہے۔ ۴۰ لاکھ میں سے ۱۳۷ لاکھ کو غیر قانونی شہری قرار دیا گیا ہے۔ اس میں فردکشی کی ایسی بھرمار ہوگی جو سیاہ قوانین سے ختھی ہے۔

بی جے پی کے دیگر منصوبوں کی طرح یہ بھی ایک مسلمان مخالف پالیسی ہے۔ غیر قانونی شہریوں کے نام پر بچھائے جانے والے جال میں کچھ ہندوؤں کو بھی گرفتار کیا گیا ہے۔ اُن کے لیے امیت شاہ نے کہا ہے کہ انھیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ اُن کے لیے شہریت کا حصول آسان بنانے کی غرض سے حکومت ایک بل پارلیمان سے منظور کرانے کے لیے تیار کر چکی ہے۔ سوائے مسلمانوں کے، عیسائی، بدھ مت، جین، پارسی اور سکھوں کے لیے بھی آسانیاں فراہم کی جائیں گی۔

مذہب کے نام پر ووٹروں کی تقسیم سے بی جے پی کو فائدہ ہوتا ہے۔ خاص طور پر جنوبی بنگال میں جہاں مسلمانوں کی آبادی ایک تہائی سے زائد ہے۔ یہاں بی جے پی مقامی پارٹی سے سیاسی جنگ کر رہی ہے۔ جنوبی بنگال کا شمار اُن علاقوں میں ہوتا ہے جہاں امیت شاہ نے ان دیمکوں پر تنقید کی ہے۔ یہاں کی مسلمان آبادی مسئلہ نہیں بلکہ اصل بھوت بی جے پی ہے جو مذہبی بنیادوں پر تناؤ پیدا کیے ہوئے ہے جس کی وجہ سے ہندوستانی جمہوریت کی بنیادیں کمزور ہو رہی ہے۔

(ترجمہ: جاوید احمد خورشید)

"India's hunt for 'illegal immigrants' is aimed at Muslims". ("economist.com".July 11, 2019)

آسام میں بھارتی حکومت کا پاگل پن!

آسام کی حکومت نے اپنے شہریوں کو غیر ملکی قرار دینے کا آغاز کر دیا ہے۔ بھارت کی مرکزی حکومت بھی ریاست آسام کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ایسے ہی اقدامات کرنا چاہتی ہے۔

آسام کا علاقہ پراگ (Prague) سے بھی گرم آب و ہوا کا حامل ہے۔ یہاں نہ تو زیک (Czeck) کے دارالحکومت کی طرح چوراہے ہیں اور نہ پتلی پتلی گلیاں۔ یہاں جست کے چھتوں والے گھر، پام اور آم کے کھیت ہیں۔ آسام کے اس ماحول کو فرانز کافکا (Franz Kafka) [فرانز کافکا کا شمار بیسویں صدی کے اہم ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ جرمن زبان کا یہ مصنف ہنگری میں ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوا اور ۴۰ سال عمر پا کر ٹی بی کے مرض میں جان دی۔ اس کے ناولوں اور افسانوں کا دنیا بھر کی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ اردو زبان میں بھی کئی مصنف ایسے ہیں جنھوں نے کافکا کے سوانحی حالات اور کاموں کو اردو میں پیش کیا۔] بھی اپنے گھر جیسا ہی محسوس کرتا۔ یہ ریاست پہاڑوں پر ہونے والی چائے کی کاشت کے حوالے سے مشہور ہے اور بھارت کے شمال مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ یہاں ۲۰۰۶ء سے نیشنل رجسٹر آف سٹیزن (National Register of Citizens) ترتیب دیا جا رہا ہے۔ اس کا مقصد سائنسی بنیادوں پر یہاں کی کثیر آبادی پر مشتمل مشتبہ بنگلا دیشیوں کو اصل بھارتیوں سے علیحدہ کرنا ہے۔

غیر قانونی شہریوں کی تلاش اور ان کے خلاف قانونی کارروائی جیسے اقدامات کے برعکس آسام کی حکومت اپنے تیاتیس ملین (تین کروڑ تیس لاکھ) افراد کے خلاف ہے۔ اکثریت غریب اور اَن پڑھ افراد کی ہے جنھیں مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ سرکاری اداروں کے سامنے پیش ہو کر اپنی شہریت ثابت کریں۔ جو لوگ حراست میں رہنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے ان میں سے ایک ہزار افراد ایسے ہیں جو آسام میں موجود اُن چھ حراستی مراکز میں منتقل ہو گئے، جو غیر ملکیوں کے لیے بنائے گئے ہیں۔ بھارت کے عوام اس خبر پر اچھنبے کا شکار ہیں کہ ۵۹ سالہ بیوہ، جو اعزاز یافتہ جنگی ہیرو ہے، وہ بھی خود کو بھارتی ثابت نہ کرنے کی وجہ سے حراستی مرکز میں قید ہے۔ آسام کی ریاست توقع کرتی ہے کہ اس سے بھی زیادہ افراد ان حراستی مراکز میں آئیں گے۔ اس مقصد کے لیے دس کیمپ بنائے جانے کا منصوبہ زیرِ غور ہے۔

رجسٹریشن کے نام پر یہ کھیل ۳۱ جولائی کو رُک جائے گا۔ شہریوں کی رجسٹریشن کی یہ آخری تاریخ ہے۔ اس کے بعد جو لوگ اس فہرست میں شامل ہونے سے رہ جائیں گے انھیں غیر ملکی ٹرائی بیونلز کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ وہ خصوصی متوازی عدالتیں ہیں، جن میں کسی کو اپیل دائر کرنے کا حق حاصل نہیں۔ گزشتہ سال جب نیشنل رجسٹر آف سٹیزنز کا مسودہ ترتیب دیا گیا تو اس میں آسام کی ۳ کروڑ ۳۰ لاکھ کی آبادی میں سے ۴۰ لاکھ افراد کو چھوڑ دیا گیا۔ جون کے مہینے میں ایک لاکھ کو مشتبہ غیر ملکی تصور کیا گیا۔ ان میں زیادہ تعداد بنگالیوں کی تھی۔ ان میں ہندو بھی شامل ہیں لیکن اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ ان میں آسامیوں کا شامل ہونا تو لازمی امر تھا کیوں کہ اُن کا تعلق 'مقامی' افراد سے ہے۔

حیرانی کی بات یہ نہیں ہے کہ اُن ۹۳ فیصد افراد نے، جنھیں غیر ملکی قرار دیا ہے، انھوں نے خود کو بھارتی ہونے کے بارے میں شواہد فراہم کیے ہیں۔ سرکاری مشینری، جو آسامی انتہاپسندوں اور بھارتیا جنتا پارٹی کے اثر میں ہے، اسے زیادہ سے زیادہ درخواستیں نامنظور کرنے کا لالچ دیا گیا ہے۔ مرکزی حکومت نے اس سارے مرحلے کو ایک کامیابی قرار دیا ہے۔ مرکزی حکومت یہ بھی چاہتی ہے کہ نیشنل رجسٹر آف سٹیزن اور فارنرز ٹرائیبونل کو ملک کے دیگر حصوں میں بھی لے جایا جائے۔ بھارت کی ایک ارب تین کروڑ کی آبادی کا ۱۴ فیصد مسلمان آبادی پر مشتمل ہے، جن کے یہاں اس حوالے سے خوف پایا جاتا ہے کہ آسام میں جو کچھ بھی مسلمان آبادی کے ساتھ ہو رہا ہے ان کے ساتھ بھی کہیں ایسا ہی نہ ہو۔ اس صورت حال میں بھارت کے دیگر حصوں میں بسنے والی مسلمان آبادی کا پریشان ہونا درست ہے۔

گوروئی مری (Goroimari) کے چھوٹے چھوٹے دیہاتوں سے قریب سرسبز برہم پوترا وادی ہے جہاں بنگالی بولنے والی آبادی بستی ہے، وہ این آر سی (NRC) کے خوفناک چُنگل سے نکلنے کی بالکل بھی کوشش نہیں کر رہی ہے۔ سومی رُن نِسا (Somiron Nisa) ہی کو دیکھیے جس نے ابھی گریجویٹ کیا ہے، اس کا پورا گھرانہ این آر سی کی فہرست سے بچ نکلا اور اب انھیں اصل شہری قرار دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے انھیں غیر ملکی قرار دیا گیا تھا۔ این آر سی کے اہلکار نے بتایا کہ یہ اس لیے ہوا کہ انھیں فہرست میں ڈی (D) لکھا گیا تھا۔ ڈی سے مراد الیکشن کمیشن نے ایسے افراد کو مشتبہ ووٹر (doubtful voter) قرار دیا ہے۔ یہ بھی نشاندہی کی گئی کہ محترمہ نِسا اپنے گھرانے میں واحد 'غیر ملکی' (foreigner) قرار دی گئی تھی۔ اس وقت اس کی عمر اتنی بھی نہیں تھی جو ووٹ ڈالنے کے لیے درکار ہے۔ اس بارے میں متعلقہ افسر نے کندھے اُچکا کر جواب دیا۔

۹۳ سالہ شمس الدین کی سنیے جو ایک اَن پڑھ کسان ہیں۔ یہ اُس وقت پیدا ہوئے، جب یہاں کی آبادی چند مٹھی بھر گھروں پر مشتمل تھی۔ ان کا نام بھی مارچ کے مہینے میں این آر سی میں آیا تھا۔ ایک دیباجت گوسوامی (Debajit Goswami) نے ان کے نام کو شامل کرنے پر اعتراض کیا تھا۔ شمس الدین اُس شخص کو نہیں جانتے تھے جس نے ان پر الزام لگایا تھا۔ اس دیہات میں ایسا کوئی کر بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک وکیل اور مقامی این جی او گوسوامی کے درج پتے پر اسے تلاش کرنے میں ناکام رہے۔ گوسوامی اُن سماعتوں میں بھی حاضر نہ ہوا جن میں شمس الدین کو بلایا گیا تھا۔ یہ سماعتیں دو مختلف جگہوں پر ہوئیں جن کے درمیان ۱۵۰ کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔

ایسا شاید اس لیے ہوا ہے کہ گوسوامی کا نام اُن سیکڑوں خطوط پر موجود ہے، جو اعتراض دائر کرنے کے لیے جمع کیے گئے اور ان میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ مشتبہ غیر ملکیوں کا نام این آر سی کی فہرست سے نکالا جائے۔ ان قوانین کو سپریم کورٹ نے ترتیب دیا ہے، جس میں کسی فرد کو اجازت نہیں کہ وہ کسی کی شہریت کو چیلنج نہ کر سکے۔ صرف اس ضلع میں مشتبہ معترضین کی ایک چھوٹی سی تعداد ہے، جن کا تعلق آسام کے مقامی گروہ سے ہے اور انھوں نے اعتراض پر مبنی تیس ہزار سرٹیفکیٹ لکھے۔ اس ریاست میں دو لاکھ بیس ہزار زہریلے خطوط (poisoned letters) مئی کی آخری تاریخ سے پہلے جمع کیے گئے۔ بھارت کے شمال مشرق میں جو ابی طور پر آسام سے تعلق رکھنے والوں سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ این آر سی میں شامل ہیں اور ثبوت نہ فراہم کرنے کی صورت میں ان کو واپس روانہ کیا جا رہا ہے۔

شمس الدین کے ایک پڑوسی راحم علی (Rahum Ali) نے طنزیہ انداز میں بتایا کہ 'یہاں کوئی بھی ایسا نہیں جس کا تعلق بنگلا دیش سے ہو'۔ 'وہ یہاں کس طرح سکونت اختیار کر سکتے ہیں؟ یہاں کوئی جگہ نہیں۔ بھائی بھائی آپس میں لڑ رہے ہیں'۔ ۷۰ سالہ علی کا نام این آر سی میں موجود نہیں جبکہ اس کے تین بھائی اور دو بہنوں کے نام اس فہرست میں شامل ہیں۔

این آر سی کے ایک دفتر سے اُسے حاضر ہونے کا حکم نامہ ملا جس میں اُسے بتایا گیا ہے کہ اُس کا کیس زیرِ التوا غیر ملکی ٹرائیبونل (Pending Foreigners' Tribunal) میں ہے جس کا اختصار پی ایف ٹی (PFT) ہے۔ اس کے بعد مختلف ٹاؤن میں موجود دفاتر سے اسے چار مرتبہ سے زائد سمن جاری ہوئے اور ہر بار اسے خوف رہا کہ کہیں اسے جیل میں نہ ڈال دیا جائے، لیکن ان تمام حکم ناموں کا مقصد صرف یہ بتانا تھا کہ اس کا کیس پی ایف ٹی میں ہے۔ آج بھی اسے یہ نہیں معلوم ہو سکا ہے کہ ۱۰۰ فارن ٹرائی بونلز میں سے کس کے سامنے اسے حاضر ہونا ہے۔ ایک مقامی وکیل نے بتایا ہے کہ اس گاؤں میں ۴۶ افراد ایسے ہیں جن کا کیس پی ایف ٹی میں ہے لیکن وہ بار بار سمن جاری ہونے کی وجہ سے پاگل ہو چکے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ کافکائی صورتِ حال (Kafkaesque situation) [کافکا کے ناولوں اور افسانوں کے اثرات انگریزی زبان پر بھی پڑے جس کی وجہ سے اس اصطلاح کو انگریزی لغت میں شامل کیا گیا جس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ سرکاری دفاتر میں ہونے والے تاخیری حربے۔] کس طرح پیدا ہوئی؟ بھارت میں اس تعلق سے دو عوامل ایسے ہیں جنھیں ان حالات کا الزام دیا جاتا ہے۔ اس میں برطانوی دورِ حکومت اور زہریلی بھارتی سیاست کو الزام دیا جاتا ہے۔ برطانوی راج میں لاکھوں بنگالیوں، جن کی اکثریت مسلمان تھی، کو آسام میں بسنے کے لیے حالات فراہم کیے گئے۔ آزادی کے بعد مقامی سیاست دانوں نے شور مچایا کہ یہ گھس بیٹھیے مقامی زبان اور ثقافت کے لیے خطرہ ہیں۔ ان حالات میں ہندو قوم پرستی کے جذبات بھی ابھر کر سامنے آئے جس کے بعد مذہبی عنصر کو بھی خوب بڑھا چڑھا کر استعمال کیا گیا اور یہ بھی بتایا گیا کہ بھارت کے قومی تحفظ کو بھی خطرہ ہے۔

اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ غیر قانونی افراد کے دعووں پر زور و شور سے گفتگو کا آغاز ہوا۔ آسامی انتہا پسندوں نے یہ شور مچایا کہ ۵۰ لاکھ یا ۸۰ لاکھ گھس بیٹھیوں نے ان کی ریاست پر قبضہ جما لیا ہے۔ ان حالات میں دائیں بازو کے سیاست دانوں نے خطرہ محسوس کیا کہ اس طرح ان کا مسلم ووٹ بینک ختم ہو جائے گا۔ دراصل یہ سب کچھ ایک ایسا بے بنیاد تخمینہ ہے جس میں لاکھوں افراد کو غیر ملکی قرار دیا گیا ہے۔ ایک وکیل نے کہا ہے کہ یہ ایک ایسا چرنوبل (Chernobyl) [چرنوبل دراصل چرنوبل نیوکلیئر پاور پلانٹ کا اختصار ہے۔ یہ پاور پلانٹ روس کے شمال میں واقع ہے جہاں ۲۶ اپریل ۱۹۸۶ء کو دنیا کی تاریخ کا خوفناک دھماکا ہوا۔] ہے، جس کی آڑ میں جھوٹ کو چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

کوئی نہیں جانتا کہ آسام کے 'غیر ملکیوں' کے ساتھ کیا ہوگا۔ انھیں واپس بنگلا دیش بھی روانہ نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ بنگلا دیش نے ان تمام حالات کو بھارت کا اندرونی مسئلہ قرار دیا ہے۔ ان لاکھوں افراد کو بھارت کے دیگر علاقوں میں بھی نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ اس تعلق سے بی جے پی نے اپنے سیکولر آئین کا مذاق اڑاتے ہوئے ایک حل یہ پیش کیا ہے کہ وہ اپنے دستور میں ہندوؤں، بدھ مت کے ماننے والوں، سکھوں، عیسائیوں کے لیے ایک تبدیلی کا بل پیش کرنے والی ہے، لیکن اس بل میں مسلمانوں کی شہریت پر خاص طور پر پابندی لگائی جائے گی۔ آسام کی گوہاٹی یونیورسٹی میں سیاسیات کے چیئرمین اور بی جے پی کے حامی نانی گوپال ماہانتا کا اُن افراد کے لیے یہ مشورہ ہے جو اس وقت مشکلات کا شکار ہیں کہ فارن ٹرائی بونلز بالکل بھی اپنا کام جلد شروع نہیں کر سکیں گے اور انھیں ۲۰ سال درکار ہیں کہ وہ ان کیسوں کو نبٹائیں۔ جن افراد کو غیر شہری (non-citizens) قرار دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بے ریاست (stateless) کہلائیں گے، لیکن کچھ مدت کے لیے ان کے حقوق سلب کر لیں جائیں گے۔ انھوں نے مزید کہا کہ آپ اس بات کو قبول کریں یا نہ کریں، دراصل شہریت (citizenship) ایک بہت ہی غیر جمہوری (democratic concept) تصور ہے۔ کافکا بھی اس خیال کی لازمی حمایت کرتا۔ (ترجمہ: جاوید احمد خورشید)

"Madness in the hills: India is declaring millions of its citizens to be foreigners". ("economist.com". Jul 11th 2019)

پروفیسر ڈاکٹر وقار احمد زبیری: ناموں کے نشاں کیسے کیسے

جاوید احمد خورشید

پروفیسر وقار احمد زبیری ایک فعال زندگی گزار کر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ کم و بیش ۸۰ سال کی عمر پائی۔ مختصر علالت کے بعد ۲ جولائی ۲۰۱۹ء کو کراچی میں انتقال کیا اور اگلے روز مقامی قبرستان میں سپردِ خاک کیے گئے۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ اس مردِ خلیق کی مغفرت فرمائے۔ ان کی علم حیوانیات پر کئی اہم تحقیقات یادگار ہیں، جو تلاش و جستجو کے باعث اپنے اپنے موضوعات پر اضافہ ہیں۔ اردو ادبیات سے دلچسپی اور اردو زبان سے شیفتگی کسی سے مخفی نہیں۔

بچپن مراد آباد اور شاہ گنج میں گزرا۔ کم عمری کے ایام ریلوے میں ملازم اپنے ماموں مشرف علی زبیری کے یہاں گزارے جن کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اسکول کی عمر تک پہنچتے ہی مراد آباد میں مقیم اپنی خالہ کے پاس بھیج دیا گیا جہاں ہوش و حواس میں پہلی مرتبہ اپنے والد انیس احمد زبیری کو دیکھا۔ کچھ دنوں بعد اپنے بہن بھائیوں کے پاس شاہ گنج بھیج دیے گئے جہاں اپنے والد کے پاس وقت گزارا۔ پروفیسر وقار زبیری نے اپنے والد کے بارے میں ''چھپر چھاؤں'' کے عنوان سے لکھا ہے کہ وہ ''خوش پوش، خوش شکل، دراز قد، ہاکی، فٹ بال اور کرکٹ کھیلنے کے شوقین، علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی، مولانا روم اور حفیظ جالندھری کی شاعری کے دل دادہ تھے۔ کسی بزرگ نے انھیں سانپ کا زہر اتارنے کا عمل اس شرط کے ساتھ بخش دیا تھا کہ جب کہیں سے سانپ کے کاٹے کی اطلاع ملے تو فوراً جانا۔ وہ اس پر پوری طرح عمل کرتے۔ یوں شاہ گنج میں ایک محترم فرد کے طور پر شناخت کیے جاتے۔ ان دنوں شاہ گنج ایک ایسا قصبہ تھا جہاں سانپوں کی بہتات تھی اور برسات کے دنوں میں تو افراط ہوتی تھی۔ یہ دن والد کے لیے بہت مصروف گزرتے۔''

(''جو دیکھا، لکھا''، مجموعۂ مضامین، از پروفیسر ڈاکٹر وقار احمد زبیری، بزمِ سائنسی ادب، کراچی، ۲۰۱۷ء، ص ۴۰۹)

آپ اردو یونیورسٹی سے بحیثیت پروفیسر سبکدوش ہوئے۔ وہاں مدرس اور ماہرِ حیوانیات کے خدمات انجام دیں۔ ۲۰ اگست ۱۹۵۸ء کو اردو کالج کے سال سوم میں داخلہ لیا اور اسی سال حیوانیات اور نباتیات کے مضامین میں بی ایس سی کی تدریس شروع کی۔ اعلیٰ ثانوی تک تمام مضامین ہندی میں پڑھے۔ آہستہ آہستہ اردو پڑھنے کی وجہ سے مضامینِ حیوانیات بہتر انداز میں سمجھ آنے لگے۔ ۱۹۶۲ء میں لیکچرار ہوئے اور ۱۹۶۷ء میں تحقیق کے لیے جامعہ کراچی چلے گئے۔ تدریس کی منصبی ذمے داریوں سے سبکدوش ہونے کے بعد مذہبیات اور سماجی علوم (ششماہی ''معارف مجلۂ تحقیق'' اور ششماہی تحقیقی مجلّہ ''تحصیل'' کراچی) کے حامل تحقیقی مجلّات کی مجالسِ مشاورت و ادارت کا حصہ رہے۔ علمی موضوعات سے دلچسپی تنوع کی حامل رہی۔ مذہبی علوم، ادبیاتِ اردو اور علمِ حیوانات سے خاص شغف رہا۔ کئی تحریریں ان کی غماض ہیں۔

پاکستان کا قیام اور دہلی میں پہلا سفارتی تقرر

سلطان محمد خان

جون ۱۹۴۷ء میں دو ہفتے کا وقفہ ملا اور جاؤرہ چلا گیا۔ ہماری دوسری بیٹی نزہت چند ماہ کی تھی، اس کے اور شاہدہ کے ساتھ اچھا وقت گزرا۔ ایک روز حکومت ہند کا ایک تار آیا جس میں کہا گیا تھا کہ حکومت کے جملہ ملازمین کو صوابدید پر چھوڑا گیا ہے کہ وہ ہندوستان میں ملازمت کرنا پسند کریں گے یا پاکستان میں۔ اس سلسلے میں میری پسند کے بارے میں جلد از جلد جواب مانگا گیا تھا۔ میرا اپانسہ ہندوستان میں تھا، مستقبل کے پاکستان میں کسی سے واقف نہیں تھا، مجھ میں سیاسی خُو بُو نہیں تھی ہر وہ شخص جس سے مجھے پیار تھا وہ ہندوستان میں تھا اور میری تمام جائیداد بھی یہیں تھی۔ میں اس بارے میں سوچتا ہی رہا فیصلہ نہ کر سکا تو مشیت ایزدی پر چھوڑ دیا۔ وہ دن نواب جاؤرہ کی سالگرہ کا تھا، جو میرے خسر بھی تھے۔ پورا خاندان مبارکباد دینے محل میں جمع تھا، جب سب لوگ جا چکے تو میں نے عرض کیا کہ کچھ کہنا چاہتا ہوں، اجازت پا کر وزارت داخلہ کا تار دکھایا، جب میں نے اپنا جواب بھی ملاحظہ کرایا تو ان کا ناخوش ہونا واجب تھا۔ وہ نہ صرف ریاست کے حکمراں تھے بلکہ خاندان کے سربراہ بھی تھے۔ جواب ارسال کرنے سے قبل ان کی رائے اور منظوری لینا چاہیے تھی، اس کے بعد انہوں نے اس مسئلے پر پھر کبھی بات نہیں کی اور مجھے اپنی دنیا آپ بنانے پر چھوڑ دیا۔

جب میں جون کے آخر میں دہلی واپس آیا تو ماحول میں تین تبدیلی تھی۔ سکھوں کی بڑی تعداد جنہیں شمال مغرب اور پنجاب کے مغربی علاقوں سے نکال دیا گیا تھا دہلی آ گئے تھے۔ وہ اپنا مال و متاع اور جائیداد کھو چکے تھے، کچھ کے افرادِ خاندان بھی مارے گئے تھے۔ جیسے جیسے یوم آزادی اور تقسیم ملک کا دن یعنی ۱۴ر اگست نزدیک تر ہوتا جاتا تھا ویسے ہی ان لوگوں کی شبینہ مجلسیں گرم ہوتی جاتی تھیں۔ ان مجالس میں بدلہ اور غصب شدہ متاع کی واپسی کا مطالبہ زور و شور سے کیا جاتا تھا۔ مسلم باشندگانِ دہلی کے بارے میں ان کے الفاظ میں تلخی اور اقدامات میں جارحیت آ گئی تھی اور وہ بے چارے زبوس ہو کر نصیب لکھے کے منتظر بیٹھے تھے۔ میٹکاف ہاؤس کا ٹریننگ پروگرام اس ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ باہمی گفتگو کا موضوع قتل و غارت کی مختلف مقامات سے آنے والی خبریں تھیں، یا آزادی کی توقعات! جب مسلم آفیسروں میں سے کوئی اس گفتگو میں شریک ہوتا تو ہمارے ہندو ساتھی محتاط ہو جاتے اور تیور بھی قدرے کڑوے کر لیتے۔ ردعمل میں مجوزہ پاکستان میں ملازمت کو منتخب کرنے والے ایک دوسرے کے نزدیک آ گئے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کا میرا ایک ہندو دوست دہلی کا باشندہ تھا میں بارہا اس کے گھر جا چکا تھا، اس کے گھر میں میری پذیرائی بھی خوب ہوتی تھی لیکن جب میں جولائی کے آخر میں ملاقات کے لیے گیا تو وہ متفکر ہو گیا اور گھر کے اندر آنے کی دعوت بھی نہیں دی بلکہ یہ کہا کہ وقت بدل گیا ہے۔ تمہارا یہاں آنا خلاف مصلحت ہے، میرے اور میری فیملی کے لیے بھی خالی از خطرہ نہیں کیونکہ لوگ مجھے تمہارے جیسا سمجھ لیں گے۔ مجھے یہ سُن کر صدمہ ہوا لیکن یہ بھی جان گیا کہ یہ دوست زندگی کے حقائق بیان کر رہا ہے، جو دہلی اور دیگر مقامات پر نمایاں ہیں۔

۱۴ر اگست کو ہم نے قائداعظم کی تقریر سنی، جو پاکستان کی آزادی پر کراچی سے نشر ہوئی تھی۔ ۱۴ر اگست کی نصف شب گزرتے ہی پنڈت نہرو نے بھی آزادیٔ ہند کا اعلان کر دیا۔ کیونکہ ہندو نجومیوں نے ۱۴ر اگست کو مبارک دن نہیں مانا تھا، ایوان وائسرائے پر میٹکاف ہاؤس سے ہم سب کو بھی قبل از اعلانِ آزادی کے استقبالیہ میں مدعو کیا گیا تھا۔ ۱۵ر اگست کو بھی عام استقبالیہ جو امپیریل گیٹ وے کے کشادہ میدان میں منعقد کیا گیا تھا، اس میں ہم مدعو تھے لیکن یہ عام استقبالیہ جلد ہی بدنظمی اور انتشار کا شکار ہو گیا۔ عوام جذباتی اور بے قابو ہو گئے، یہ ایک عجوبہ ہی تھا کہ ماؤنٹ بیٹن، ان کے اہل و عیال، پنڈت نہرو اور دیگر قائدین ہند اس بھگدڑ سے کس طرح صحیح سالم نکلنے میں کامیاب رہے!

سرحد کے دونوں طرف فرقہ وارانہ مارکاٹ زیادہ ہو گئی تھی۔ انسانوں کے غول تھے کہ بے خانماں ہو کر اِدھر سے اُدھر حیران اور پریشان ہجرت کر رہے تھے۔ دہلی جلد ہی قتل و غارت گری کی آگ میں جھلس گیا۔ مسلمانوں کے مکانات پر قبضہ کیا جانے لگا۔ قرول باغ، عیدگاہ، پہاڑ گنج، دریا گنج اور چاندنی چوک جیسے مقامات پر مسلم مقبوضہ جائیدادوں پر حملے اور لوگوں کا صفایا ہو رہا تھا۔ ایسے میں پولیس یا تو خاموش تماشائی تھی یا اس مقام سے کھسک جاتی تھی۔ دہلی کو پولیس فورس میں جتنے مسلمان تھے ان کو غیر مسلح کر کے گھر بیٹھنے کو کہہ دیا گیا تھا۔

آزادی کی اس افراتفری اور خلفشار میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہمیں بھلا دیا گیا ہے۔ لہٰذا سجاد حیدر، افتخار علی اور میں نے فیصلہ کیا کہ ہم پاکستان ہائی کمیشن (سفارتخانہ) جائیں جو اس وقت نوابزادہ لیاقت علی خان وزیراعظم پاکستان کی رہائش گاہ دہلی، بنام گُل رعنا میں واقع تھا اور آج تک ہے۔ گُل رعنا کے احاطے پر پاکستان کا جھنڈا لہراتا ہوا دیکھتے ہی دل میں ایک ولولہ پیدا ہوا، پاکستان کے ہائی کمشنر مسٹر زاہد حسین کو مبارکباد پیش کی۔ وہ بزرگ اور مہذب انسان تھے، ماہر اقتصادیات و مالیات تھے، لیکن اس وقت صحت گری ہوئی تھی۔ جیسے ہی انہیں علم ہوا کہ ہم کون ہیں تو فرمانے لگے کہ تمہاری خدمات کی سخت ضرورت ہے، اس لیے میٹکاف ہاؤس فوراً چھوڑ دیں اور پٹودی ہاؤس منتقل ہو جائیں جو سینئر سرکاری ملازمین کی جائے قیام ہے اور اگلے روز گُل رعنا آ کر کام پر لگ جائیں۔ دو کمرے مسٹر زاہد حسین کے لیے وقف تھے بقیہ حصے میں دفاتر تھے۔ مسٹر اختر حسین (جو بعد میں روم اور ماسکو وغیرہ میں سفیر رہے) نائب ہائی کمشنر تھے اور مسٹر حسن فیروز (بعد میں چیف پاسپورٹ آفیسر کراچی) فرسٹ سیکرٹری تھے اور مختلف اقسام کے نائبین، اہلکاران اور ڈرائیوروں کے انچارج تھے۔ فیروز دہلی کے قدیمی باشندے تھے، سیکریٹریٹ کے ممتاز افسر اور انسانی معلومات میں دائی اماں کا درجہ رکھتے تھے۔ حکومتِ ہند و پاکستان کی تقریباً تمام معروف ہندو مسلم ہستیوں کے شجروں اور ان کے ماضی و حال سے بخوبی واقف تھے۔ دہلی میں لاقانونیت کا دور دورہ ہونے کے باوجود فیروز دفتر پابندی سے آتے تھے۔ اپنی ظریفانہ طبیعت اور بذلہ سنجی سے ان پُرآشوب ایام میں بھی انہوں نے ہمارے مزاجوں کو بشاش رکھ کر ہمیں برسرکار رکھا۔

۲۰ر اگست تک ایسا ماحول ہو گیا کہ پٹودی ہاؤس میں رہنا مخدوش ہو گیا۔ لہٰذا سجاد، افتخار اور میں گُل رعنا چلے آئے۔ انہی دنوں مردوں عورتوں اور بچوں کا ہجوم گُل رعنا میں سر چھپانے کے لیے آ گیا۔ ان میں کچھ بیمار تھے، کچھ تلوار کے زخم خوردہ، دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کی آمد کا یہ سلسلہ سیلاب کی شکل اختیار کر گیا۔ اندرون خانہ جب کوئی جگہ نہ رہی تو لوگ چھت پر، مکان کے سامنے اور عقب میں جو لان تھے اُن پر، جہاں بھی جگہ ملی وہیں پڑ رہے۔ دفتری کام کا شائبہ بھی نہ رہا اور فکر لاحق ہو گئی اس مخلوق کے کھانے پینے، علاج معالجہ، ادویات کی

فراہمی، حفظانِ صحت اور تحفظ کی۔ اس وقت تک بہت سے ممالک نے اپنے سفارت خانے نئی دہلی میں کھول لیے تھے، جب ان کے عملے کے مقامی مسلمانوں کو خطرات لاحق ہوئے تو کچھ سفراء پنڈت نہرو سے ملے اور سفارت خانوں کے تحفظ کی طرف توجہ دلائی۔ ان کا جواب تھا ''میں اپنی ہی حفاظت نہیں کرسکتا تو آپ کی حفاظت کیسے کرسکتا ہوں؟ آپ کہیں بھی جانے کے لیے آزاد ہیں، حالات معمول پر آجائیں تو لوٹ آنا''۔ ایک روز میں نئی دہلی کے کناٹ پیلس کی دکانوں کے پاس سے گزر رہا تھا تو دیکھا اس علاقے کی واحد مسلم غنی کی دکان لوٹی جارہی تھی، قریب ہی کچھ سپاہی چارپائیوں پر سونے کا ناٹک کر رہے تھے۔ یکلخت ایک کار آکر رکی اور پنڈت نہرو اس میں سے برآمد ہوتے ہی اُن بناوٹی خوابیدہ پولیس والوں کی طرف لپکے، اُن میں سے ایک کی لاٹھی اٹھا کر انہی پر پل پڑے۔ انہیں للکارتے بھی جاتے تھے کہ اس لوٹ کو روکو! سپاہی ہندوستان کے وزیراعظم کو دیکھ کر ہکا بکا ہوگئے اور فوراً ان کے حکم کی تعمیل میں جٹ گئے اور دکان کو پوری طرح غارت گری سے بچالیا۔ مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ان کے جاتے ہی غارتگری پھر شروع ہوگئی ہوگی۔

گُل رعنا کا جائے وقوع پُرخطر تھا۔ یہ ایک ایسا آسان نشانہ تھا کہ کسی وقت بھی حملہ ہوسکتا تھا۔ بلوچ رجمنٹ کے دس سپاہیوں پر مشتمل ایک سیکشن صدر دروازے پر تعینات تھا اور قطعی اس قابل نہیں تھا کہ پورے مکان کا دفاع کر سکے۔ لیکن ہمارے پاس اسلحہ اور گولہ بارود کا وافر ذخیرہ تھا جو پناہ گزیں اپنے ساتھ لائے تھے۔ سادہ کاغذ کے ٹکڑوں پر ان اسلحہ کی رسیدیں ان کے مالکوں کو دے دی گئی تھیں۔ پاکستان جانے کے بعد ان کے ہتھیار ان کو واپس مل گئے۔ سجاد، افتخار اور میں ہم تینوں نے گُل رعنا کے چاروں طرف دفاع کا ایک حلقہ ترتیب دیا اور جسمانی لحاظ سے موزوں جوان آدمیوں کو چُن کر رات کو مدافعت کے لیے چوکس رکھا۔ جھٹپٹے سے صبح صادق تک ہم باری باری ان کی مستعدی کو چیک کرتے رہتے تھے۔ سیکڑوں آدمیوں کے کھانے پینے کا بندوبست ہماری ثانوی پریشانی تھی۔ کاروبار تقریباً ختم ہوچکا تھا، دکانیں بند تھیں۔ ہائی کمیشن کے چند آنے والوں میں ایک لالہ شری رام بھی تھا، دہلی کا مشہور صنعتکار، جس کا ایک کپڑے کا کارخانہ پاکستان میں بھی تھا، اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر وہ ہائی کمشنر سے مدد کا طالب تھا، وہ ایک ٹرک بھر کر چاول کی بوریاں اور پرمل کی سبزی لے آیا۔ ہفتہ بھر یہی ہماری غذا رہی اور وہ بھی بغیر نمک کے! رکابیوں کی قلت تھی، اس لیے ہم میں سے بیشتر اپنی خوراک دھوبیوں میں بھر لیتے، دوبارہ لینے کے لیے پھر لائن میں لگنا پڑتا، کھانا اتنا نہیں ہوتا تھا کہ تیسری مرتبہ لینے کی باری آئے۔

ہائی کمشنر مسٹر زاہد حسین پرانے قلعے کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تاکہ گل رعنا میں مسلسل آنے والے پناہ گزینوں کے قافلوں کو وہاں سر چھپانے کی جگہ مل جائے۔ روزانہ تقریباً ایک درجن ٹرکوں میں بھر بھر کر ان لوگوں کو قلعہ میں منتقل کیا جاتا۔ سولہویں صدی عیسوی میں اس قلعہ کی تعمیر شہنشاہ ہمایوں نے کی تھی، ۱۹۴۷ء تک اس کی باقیات میں صرف دیواریں اور صدر دروازہ تھا۔ اندرون قلعہ ہوحق تھا، ویران وسیع و عریض میدان، جس میں چند درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ موسلا دھار بارش نے کیچڑ آلود کر رکھا تھا۔ دیواروں تلے جن لوگوں نے سر چھپانے کے انتظامات کیے ان میں سے بیشتر دیوار سے گرنے والے پتھروں سے شدید زخمی ہوگئے۔ ملیریا اور پیچش تو عام بیماریاں تھیں، مزید یہ کہ ان آفات سے چھٹکارے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی تھی۔

جب ہم اس مایوس کن صورتحال سے نبرد آزما تھے تب ہی ہائی کمشنر اور نائب ہائی کمشنر کو کراچی صلاح مشورے کے لیے طلب کرلیا گیا اور وہ وہیں ٹھہر گئے۔ ایک آئی سی ایس افسر انعام الرحیم نائب ہائی کمشنر مقرر ہوئے، مگر ابھی انہیں چند روز ہی ہوئے تھے کہ ان کی جگہ میاں عبدالعزیز کو مقرر کردیا گیا۔ یہ صاحب سابقہ کپورتھلا ریاست کے دیوان رہ چکے تھے، اردو کے مشہور ادیب تھے، فلک پیما کے قلمی نام سے مشہور تھے۔ یہ بڑے شائستہ انسان اور باہمی گفتگو میں بڑے دلچسپ تھے، لیکن دہلی کے جانگسل حالات میں کام کرنا ان کے بس میں نہ تھا، لہٰذا ان کی مدت بھی جلد ختم ہوگئی۔

وزیراعظم لیاقت علی خان نے خود حالات کو ملاحظہ کرنا چاہا، اس لیے ستمبر کے اوائل میں دہلی تشریف لے آئے، پرانے قلعے میں ان کی آمد کی یاد ابھی تک میرے ذہن میں تازہ ہے۔ ان کی حفاظت کی خاطر ہتھیار بند بہت سے ہندوستانی افسر ان کے ہمراہ چل رہے تھے لیکن جیسے ہی وہ صدر دروازے میں داخل ہوئے، ان محافظین کو برطرف کرکے پاپیادہ آگے بڑھ گئے۔ راستہ کے دونوں طرف زبوں حال افراد قطار در قطار کھڑے تھے۔ وہ لوگ جو اپنا سب کچھ کھو چکے تھے، وہ لوگ جو اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے چہیتوں کو قتل ہوتا دیکھ چکے تھے، وہ غیض و غضب میں تلملا رہے تھے مگر ہندوستانی افسروں کے سامنے اپنے وزیراعظم کو مشکلات میں نہ ڈالنے کے الہامی جذبے کے تحت پُروقار اور صبر و استقامت سے اُف تک نہ کی۔ لیاقت علی خان کے چہرے پر آنسوؤں کی لڑیاں بہہ نکلیں، لیکن کسی کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا! اس سلسلے میں جب پنڈت نہرو سے انہوں نے گفتگو کی تب کہیں جا کر مدد کے فوری اقدامات عمل میں آئے اور ہفتے میں دوبار نظام الدین ریلوے اسٹیشن سے ٹرین پرانے قلعہ کے پناہ گزینوں کو پاکستان لے جانے لگی۔ جو بات کئی دن تک معلوم نہ ہوسکی وہ یہ تھی کہ ان میں سے دو ٹرینیں ایسی تھیں کہ جب لاہور پہنچیں تو ایک بھی مسافر زندہ نہیں بچا تھا۔ اُدھر بھی کچھ ٹرینیں ایسی تھیں جو پاکستان سے امرتسر پہنچیں وہ بجائے زندہ انسانوں کے لاشوں یا نیم جان مسافروں سے پٹی پڑی تھیں۔ ستمبر کے وسط سے دہلی میں حالات معمول پر آنا شروع ہوگئے تھے، کیونکہ حکومتِ ہند نے تیسری مدراس رجمنٹ کو نظم و ضبط قائم کرنے کے لیے دہلی طلب کرلیا تھا۔ یہ رجمنٹ فرقہ وارانہ ذہنیت سے عاری تھی۔ انہوں نے صرف یہ کیا کہ قتل و غارت گری میں ملوث چند شرپسندوں کو مختلف مقامات پر شوٹ کردیا اور اس طرح ان قاتلوں اور غارت گروں کی عقلیں ٹھکانے آنے لگیں۔

مجھ پر بار بار ملیریا کے حملے ہونے لگے۔ اُبلے چاولوں اور پرملوں نے بھی اپنا رنگ دکھانا شروع کردیا اور میں کئی روز بیمار رہا۔ حالات کو قدرے معمول پر آتا دیکھ کر کچھ دنوں کی رخصت آرام کی غرض سے لی اور جاؤرہ چلا گیا۔ دو ہفتے وہاں رہ کر پھر دہلی واپس آگیا، لیکن چونکہ براہ راست دہلی کا سفر اب بھی خالی از خطرہ نہیں تھا لہٰذا میں نے چکردار راستہ اختیار کیا۔ مسلح گارڈ کے ساتھ بمبئی گیا اور وہاں سے کشتی کے ذریعے کراچی اور وہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعہ دہلی پہنچا۔

کراچی کا یہ میرا پہلا سفر تھا۔ دہلی کے پرآشوب تین ماہ گزارنے کے بعد پہلی بار خوف اور خطرات سے نجات ملی، قلب کو سکون نصیب ہوا گنجان سڑکوں پر پس پشت آنے والے آدمی کو تکھیوں سے دیکھے بغیر بے خوف گھوم سکتا تھا۔ میں سیدھا پیلس گیا جہاں وزارت خارجہ کا دفتر قائم کیا گیا تھا، وہاں میں نے حب الوطنی کا جوش و خروش اور خود سپردگی کا جذبہ ہر ایک میں دیکھا۔ ذاتی بے آرامی اور ضروریاتِ دفتر کی قلت پر نہ کوئی شاکی تھا نہ ہراساں، ہر شخص کو ایک دھن سوار تھی کہ بہتر سے بہتر کام کرے۔ وزارت خارجہ کے پہلے سیکرٹری مسٹر اکرام اللہ سے ملنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ

انتہائی مصروف ہوں گے اوراس وجہ سے بھی کہ میں بہت جونیئر افسر تھا، لیکن جیسے ہی وہ کار سے اتر کر دفتر کی طرف بڑھے انہوں نے ایک اجنبی کو کھڑے دیکھا تو پوچھ بیٹھے، کہ میں کون ہوں اور یہاں کیا کر رہا ہوں؟ ان کے سوالات کے جواب دے چکا تو مجھے خوش آئند حیرت ہوئی، وہ مجھے اپنے دفتر میں لے گئے اور دہلی ہائی کمیشن کے بارے میں ڈھیر سارے سوالات کرڈالے۔ میرے جانے سے پہلے مسٹر اکرام اللہ نے کہا کہ مجھے وزارت میں جلد حاضر ہونے کے لیے تیار رہنا چاہیے، کیونکہ مجھے قاہرہ بھیجا جائے گا جہاں ہمارا نیا سفارت خانہ کھلا ہے۔ درحقیقت جب میں دہلی پہنچا تو کراچی طلبی کے احکامات میرا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ دن بعد میں جاؤرہ جا پہنچا تا کہ اپنے اہل وعیال کو ہمراہ لیتا جاؤں۔ ایک بار پھر جاؤرہ سے میں ایک مسلح گارڈ کے ساتھ بمبئی روانہ ہوا اور وہاں سے بحری جہاز کے ذریعے کراچی پہنچ گیا۔ سجاد اور افتخار مجھ سے پہلے ہی کراچی جا پہنچے تھے اور بندرگاہ پر ہمیں لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ساتھ میں اشوک بھٹ کمکار بھی تھا جو الہ آباد یونیورسٹی کے زمانہ کا میرا عزیز دوست تھا اور اب کراچی میں انڈین ہائی کمیشن میں تعینات تھا۔ کراچی آنے کی خوشی عارضی تھی کیونکہ پہنچتے ہی تاروں کا ایک چھوٹا سا پلندہ ملا جس میں میرے خسر محترم کی وفات اطلاع تھی۔ پہلے تو ہم نے جاؤرہ جانے کا ارادہ کیا، مگر پھر سوچ کر ترک کر دیا اور نئی زندگی کی ڈگر پر گامزن ہونے کا ارادہ مصمم کر لیا۔

کراچی میں رہائش کی جگہ کا ملنا جوئے شیر کے حصول جیسا تھا، بڑی تگ و دو کے بعد سلور نیسٹ ہوٹل میں دو کمرے لیے۔ یہ ہوٹل کینٹن میںٹ ریلوے اسٹیشن کے پاس تھا، لیکن کرایہ پچاس روپیہ یومیہ تھا جو ۱۹۴۷ء میں ایک موٹی رقم تھی کیونکہ اس وقت میری تنخواہ چھ سو ماہوار رہی تھی، لہٰذا ایک ہفتہ بعد ہم بابے ہوٹل میں منتقل ہو گئے جس کی جائے وقوع اب چندریگر روڈ پر ہے۔ سلور نیسٹ ہوٹل کو منہدم کر دیا گیا ہے لیکن بابے ہوٹل ہنوز موجود ہے۔ موہٹہ پیلس کے دفتر خارجہ کی روزانہ آمدورفت باقاعدہ بس سروس کے فقدان اور ٹیکسیوں کے عنقا اور مہنگی ہونے سے ایک طول عمل تھا۔

آج کے مقابلے میں اس وقت کا دفتر خارجہ سادگی کا مظہر تھا۔ مجھے کریگ کوہین کے پاس کام کرنا تھا قبل آزادی کے بچے کھچے افسروں میں سے یہ بھی ایک برٹش افسر تھے جنہوں نے پاکستان کی خدمت کرنے کی خواہش کی تھی، یہ جوائنٹ سیکرٹری تھے اور صرف اکیلے ایسے افسر تھے جو مسٹر اکرام اللہ کے انتظامی معاملات میں مدد و معاون تھے۔ تنخواہوں کا تعین، تبادلوں اور اخراجات سفر کی تفصیلات وغیرہ بلا واسطہ انہی کے ذمہ تھا۔ ان امور میں وہ کارآمد اور سوجھ بوجھ کے ثابت ہوئے۔ کرنل فلیچر نے بھی جو قبل آزادی انڈین پولیٹیکل سروس میں تھے مسٹر کوہین کی طرح پاکستان کو اپنی خدمات پیش کی تھیں۔

بھوپال ہاؤس، موہٹہ پیلس کے بالمقابل ایک وسیع میدان تھا، اسے بھی دفتر خارجہ کے لیے حاصل کر لیا گیا اور یہیں میں نے قاہرہ میں اپنی تقرری کی جملہ تفاصیل تیار کیں۔ چونکہ ہم پہلی بار سفارتخانہ کھول رہے تھے، قبل ازیں نہ کوئی نظیر تھی نہ متعلقہ کاغذات کہ جن کا مطالعہ کوئی کر سکے، نہ ہی دفتر خارجہ کو تجربہ تھا اور نہ فرصت کہ کوئی تربیتی پروگرام کی کوشش کرے۔ سجاد، افتخار اور میں نے باہم ایک لائحہ عمل تیار کیا جس میں دو گھنٹے کے لنچ کا وقفہ بھی شامل تھا، جس کا کچھ حصہ ہم کلفٹن (کوٹھاری پریڈ) میں گزارتے، تا کہ دفتر خارجہ کے کینٹین کے کھانے کا نعم البدل ہو سکے۔ اس دو گھنٹے کی غیر حاضری کو تضیع اوقات پر محمول کیا گیا۔ لہٰذا ایک دن مسٹر کریگ کوہین کے روبرو ہمیں طلب کیا گیا اور ہمارے غیر مناسب رویہ پر ایک ناصحانہ تقریر کی گئی۔ مجھے ان کا یہ برتاؤ ناگوار گزرا، کیونکہ انہوں نے ہم سے بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا۔ میں نے اپنی خفگی کا اظہار ''مسٹر کوہین'' کہہ کر کیا ہی تھا کہ

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی نئی کتاب

لکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔ 5
فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ فون: 021-36809201

انہوں نے مجھے غصہ سے ٹوک کر کہا: ''میرا نام کریگ کوہین ہے، کوہین نہیں''۔ میری سمجھ میں نہ آسکا کہ اس سے کیا فرق پڑا؟ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ شخص نیم یہودی تھا اور اس بات کو پسند نہیں کرتا تھا کہ صرف نصف یہودی نام سے مخاطب کیا جائے۔ اس طوفانی انٹرویو سے کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور ہمارا طے شدہ لائحہ عمل بدستور جاری رہا۔ کرنل فلیچر کو میں نے باور کرایا کہ میری دو کمسن بچیاں ہیں اور میری بیوی بغیر آیا کے نہیں رہ سکتیں اور یہ کہ ہماری آیا کے بھی ایک بچہ ہے جس کے بغیر وہ ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ یہ واضح کر کے معاملے کو میں نے اور بھی پیچیدہ کر دیا کہ میری مالی حالت قاہرہ تک ان دونوں کے اخراجاتِ سفر بھی برداشت کرنے کے قابل نہیں، وہ بہت رحم دل انسان تھے، دوسرے ہی دن اس مسئلہ کا حل نکال لیا۔ چونکہ اس وقت تک پاکستان کی خارجہ ملازمت کے بارے میں کوئی قاعدے قانون وضع نہیں ہوئے تھے اور کرنل فلیچر برطانوی قاعدے قانون سے استفادہ لے رہے تھے، اس لیے کہنے لگے: ''میرے جیسے معاملے میں وہ بعد میں کوئی فیصلہ کر سکیں گے اگر رقم کا کہیں سے میں انتظام کر سکوں تو بچے کو بھی لے جاؤں، بعد میں یہ رقم ادا کر دی جائے گی۔ کچھ مہینے بعد آیا کے بچے کے اخراجات بھی قاہرہ میں مجھے ادا کر دیے گئے۔ کرنل فلیچر صادق القول ثابت ہوئے۔

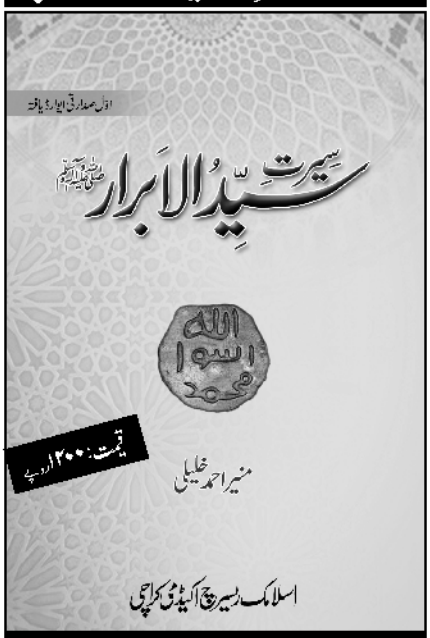

(کتاب ''چمن پہ کیا گزری'' سے اقتباس)

بقیہ: لیبیا شورش کی زد میں

رہی ہیں اور اس حوالے سے مصر جیسی علاقائی طاقت اپنے آپ کو بہتر پوزیشن میں رکھنے میں خاصی کامیاب رہی ہے۔ لیبیا ایک واضح مثال ہے کہ کس طور بڑی طاقتیں کسی کمزور یا تباہ حال ملک میں اپنے اپنے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کے نام پر طرح طرح کے کھیل کھیلتی ہیں۔ خلیفہ ہفتار کی ملیشیا انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیاں کرتی رہی ہے، مگر اس کے باوجود کوئی بھی اُسے روکنے اور ٹوکنے والا نہیں۔ اگر عام حالات میں یہی سب کچھ ہو رہا ہوتا تو ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ بہرکیف، بیرونی قوتوں نے لیبیا میں اپنے اپنے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کے نام پر خلیفہ ہفتار کی پیدا کردہ خرابیوں کو تحفظ فراہم کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ اب اسلامی گروہ ابھر رہے ہیں تو دیگر معاملات سائیڈ پکڑتے دکھائی دے رہے ہیں۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Libya In Turmoil: Khalifa Haftar And Foreign Powers". ("Observer Research Foundation". July 10, 2019)

بیچارے، اسلام سے خوفزدہ کیوں؟

ڈاکٹر صفدر محمود

کچھ باتوں کو نظر انداز کرنا بہتر ہوتا ہے لیکن چند بنیادی باتوں کی وضاحت ملک سے محبت کی مجبوری بن جاتی ہے۔ اِن تحریروں میں ایک دلچسپ تضاد بھی نظر آتا ہے جسے پڑھ کر میں زیرِلب مسکرانے لگتا ہوں۔ میرا سوال اُن پڑھے لکھے، عالم و فاضل اور محقق حضرات سے ہے، جو سچ لکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اُن میں سیکولر اور دینِ اسلام پر عالمانہ اور اجتہادی کالم لکھنے والے دونوں قسم کے معزز حضرات شامل ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ محض اتفاق ہو کہ نظریاتی حوالے سے دونوں متضاد گروہ اکثر اوقات ایک دوسرے کے مماثل نظر آتے ہیں۔ اس بات سے قطع نظر میرا اُن دونوں قسم کے عالم و فاضل حضرات سے محض ایک طالب علمانہ سا سوال ہے۔ آپ کو کیسے علم ہوا کہ قائداعظم پاکستان کو فلاحی و جمہوری ریاست بنانا چاہتے تھے؟ اگر تو آپ نے یہ بات سن کر لکھ دی ہے تو آپ اپنے قارئین سے بے انصافی کر رہے ہیں کیونکہ آپ کے قارئین آپ سے تحقیقی اور عالمانہ سچ کی توقع کرتے ہیں اور اگر آپ نے قائداعظم کی تقاریر پڑھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے تو آپ ادھورے سچ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ قائداعظم نے اپنی تقاریر میں چند بار فلاحی اور کئی بار جمہوری پاکستان کا تصور پیش کیا، لیکن انہوں نے قیام پاکستان سے قبل سو بار سے زیادہ اور قیامِ پاکستان کے بعد بحیثیت گورنر جنرل کوئی چودہ بار یہ اعلان کیا کہ وہ پاکستان کو ایک اسلامی، جمہوری ریاست بنائیں گے۔ انہوں نے بار بار یہ وضاحت کی کہ پاکستان کے دستور کی بنیاد اسلامی اصولوں پر رکھی جائے گی۔ عید میلاد النبیؐ کے موقع پر ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے اُنہوں نے پاکستان میں شریعت کے نفاذ کا عندیہ دیا اور فروری ۱۹۴۸ء میں امریکی عوام کے نام براڈ کاسٹ پیغام میں پاکستان کو پریمئر اسلامک اسٹیٹ قرار دیا۔ اَن گنت حوالوں کے پسِ منظر میں میرا ان حضرات سے یہ سوال ہے کہ جہاں آپ کو قائداعظم کے تصورِ پاکستان میں جمہوری فلاحی پاکستان نظر آتا ہے وہاں اسلامی نظر کیوں نہیں آتا، جس پر قائداعظم نے بار بار زور دیا۔ یقین کیجیے میرا کوئی ایجنڈا نہیں اور نہ ہی کوئی مقصد ہے بجز یا ماسوا قائداعظم سے منسوب تصور کی اصلاح کے۔ تحقیق کا پہلا اصول سچ ہے اور جب تحقیق کے نام پر ادھورا سچ بولا یا لکھا جائے تو سمجھ لیجیے کہ یہ کسی ایجنڈے یا وسیع پروگرام کا حصہ ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ سیکولر اور دین بیزار حضرات تو قائداعظم کے پاکستان کو محض جمہوری اور فلاحی ریاست تک محدود رکھتے ہی ہیں، میں نے بعض دینی شخصیات کو بھی اسی ایجنڈے کا ''ہرکارہ'' پایا ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ انہوں نے قائداعظم کی تقاریر پر نظر نہ ڈالی ہو اور یہ بھی ممکن نہیں کہ انہیں ان تقاریر میں اسلام کا سنگِ بنیاد نظر نہ آیا ہو یہ محض ان کی اپنی مذہب بیزاری ہے، جو جمہوری فلاحی ریاست سے پہلے ''اسلامی'' کا لفظ لکھنے نہیں دیتی حالانکہ آج کا پاکستان بھی کم سے کم آئین کی حد تک اسلامی و جمہوری ہے۔ جب اسلامی کہا جائے تو فلاحی کی ضرورت اس لیے نہیں رہتی کہ اسلامی میں فلاحی کا تصور جزو لاینفک کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسی پس منظر میں ان حضرات کی قراردادِ مقاصد سے نفرت بھی سمجھ میں آتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ قراردادِ مقاصد پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے پاس کی تھی اور اسے اس وقت کے ذی وقار وزیراعظم جناب لیاقت علی خان نے پیش کیا تھا۔ قائداعظم کے بعد قائدِ ملت لیاقت علی خان سب سے زیادہ مقبول اور مضبوط قومی لیڈر تھے۔ یہ بھی ایک لمحہ فکریہ ہے کہ یہ حضرات قراردادِ مقاصد پر وہی اعتراضات کرتے ہیں، جو اس وقت کے ہندو اور کانگریسی اراکین اسمبلی نے کیے تھے۔ کانگریسی اراکین اسمبلی کو اقلیتوں کے حقوق کے حوالے سے تحفظات تھے حالانکہ قرارداد کے پیرا نمبر ۹؍اور ۱۰ میں تمام شہریوں کو برابری، بنیادی حقوق، آزادیٔ اظہار، آزادیٔ مذہب و عقیدہ اور سیاسی و سماجی عدل کی یقین دہانی کرائی گئی تھی۔ شاید اس قرارداد کا اصل قصور یہ تھا کہ بقول جی ڈبلیو چوہدری اس قرارداد نے پاکستان کے آئین کی بنیاد اسلامی اصولوں پر رکھنے کا اعلان کیا تھا حالانکہ یہ وہی بات تھی جو قائداعظمؒ اپنی زندگی میں بارہا کہہ چکے تھے۔ میرے مطالعے کے مطابق سیکولر حضرات اور ان کے حامیوں کی قراردادِ مقاصد کو مسترد کرنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ قرارداد نے اقتدارِ اعلیٰ (Sovereignty) اللہ تعالیٰ کو سونپا تھا اور ریاست کو انہی حدود میں رہ کر قانون سازی اور پالیسی سازی کرنے کا اختیار تھا۔ سادہ الفاظ میں اس کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان میں اسلامی اصولوں کے خلاف قانون سازی نہیں ہوسکتی۔ یہ ہمارے موجودہ آئین کا بھی وصف یا نمایاں پہلو ہے۔ ان روشن خیال فاضل حضرات کا کہنا ہے کہ مغربی جمہوریت کی مانند اقتدارِ اعلیٰ عوام کی ملکیت ہونا چاہیے اور اسلامی اصولوں سے قطع نظر انہیں ہر قسم کی قانون سازی کی اجازت ملنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ پاکستان میں ان کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا، اس لیے وہ لفظ ''اسلامی'' کو پسِ پشت ڈال کر فلاحی جمہوری ریاست کا راگ الاپتے رہیں گے اور قراردادِ مقاصد پر نشانے باندھ باندھ کر پتھر مارتے رہیں گے۔ قراردادِ مقاصد کے حوالے سے مجھے مزید حیرت اس وقت ہوئی جب ایک عالم و فاضل کالم نگار نے لکھا کہ قراردادِ مقاصد کی منظوری لے پالک سیاسی قیادت کے جمہوری انحراف کا شاخسانہ تھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا ملک کے مقبول و مضبوط وزیراعظم لیاقت علی خان لے پالک سیاستدان تھے یا ان کے رفقاء جنہوں نے قراردادِ مقاصد کی حمایت کی وہ لے پالک تھے؟ کیا یہ حضرات ۱۹۴۵-۴۶ء کے انتخابات میں مسلمانوں کے ووٹوں سے منتخب نہیں ہوئے تھے؟ کیا انہیں کسی جنرل ایوب خان یا جنرل ضیاء الحق نے اپنی گود میں بٹھا کر پالا تھا؟ کیا کسی قرارداد کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے منظور کرانا جمہوری انحراف تھا؟ قراردادِ مقاصد کے مخالفین نے اس کے علاوہ ایک اور نیا شوشہ بھی چھوڑا ہے۔ ایک صاحب نے لکھا ہے کہ قراردادِ مقاصد کا مسودہ قائداعظم کی زندگی ہی میں تیار کر لیا گیا تھا اور اسے جب قائداعظم کو دکھایا گیا تو انہوں نے نامنظور کر دیا۔ قراردادِ مقاصد کے مخلص مخالفین نے قرارداد پر ضرب کاری لگانے کے لیے یہ ''اختراع'' کی ہے اور خوب سوچ سمجھ کر یہ شوشہ چھوڑا ہے۔ یہ سراسر بے بنیاد دعویٰ ہے اور محتاط رہیے کہ یہ آخری وار ہرگز نہیں!! مجھے سمجھ نہیں آتی یہ لوگ بیچارے اسلام سے اس قدر خوفزدہ کیوں ہیں؟

(بحوالہ: روزنامہ ''جنگ'' کراچی۔ ۲۴ جولائی ۲۰۱۹ء)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی شائع کردہ نئی کتاب

عالمی مسائل کے تناظر میں

پاکستان کی خارجہ پالیسی

پروفیسر ڈاکٹر سید صلاح الدین احمد

قیمت: ۴۰۰ روپے

لکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔ 5

فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون: 021-36809201

MA'ARIF FEATURE • Publisher: Shahid Hashmi; Printer: Hassan M.Abbasi, City Press, Karachi; Office: D-35, Block-5, F.B.Area, Karachi-75950